ماہنامہ

اشراق

لاہور

فروری ۲۰۲۱ء

زیرسرپرستی

جاوید احمد غامدی

”... (انسان جس جسم کے ساتھ) قیامت کے دن اٹھے گا اور اُس کا یہ جسم وہاں دوسروں کے لیے بھی مرئی ہو جائے گا، بالبداہت واضح ہے کہ اِس سے وہ جسم ہرگز مراد نہیں ہے، جسے لوگ سپرد خاک کر دیتے یا جلا کر راکھ بنا دیتے ہیں۔ قبر میں روح و جسم کے تعلق کے بارے میں جتنے مباحث ہمارے ہاں پیدا ہوئے ہیں، وہ اِسی غلط فہمی سے پیدا ہوئے ہیں۔ قرآن نے کئی مقامات پر اِس دوسرے جسم کی صراحت فرمائی ہے، لیکن اُس کا ذکر چونکہ احوال قیامت کے ذیل میں ہوا ہے، اِس لیے لوگ اِس طرف متوجہ نہیں ہوئے کہ اُس کی ابتدا برزخ ہی سے ہو جائے گی اور مرنے والے اُسی کے ساتھ قیامت میں اپنی قبروں سے نکل کر اپنے پروردگار کے سامنے حاضر ہوں گے۔ اِس وقت یہ جسم اور اِس کے حاملین اِسی زمین میں ہیں، مگر ہمارے لیے اُسی طرح نظروں سے اوجھل ہیں، جس طرح فرشتے اور جنات اپنے اجسام کے ساتھ نظروں سے اوجھل ہیں۔ تاہم معلوم ہے کہ پیغمبروں کے سامنے وہ اپنے اصلی جسم میں اور کبھی انسانوں کی صورت میں ممثل ہو کر نمایاں بھی ہوتے رہے ہیں۔“

ـــــ معارف نبوی

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن و سنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق و تنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشر و اشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن و سنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان و اخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگیِ قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ماہنامہ
اشراق
لاہور

جلد ۳۳ شمارہ ۲ فروری ۲۰۲۱ء جمادی الثانی ۱۴۴۲ھ

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
سید منظور الحسن

فی شمارہ 50 روپے
سالانہ 500 روپے
رجسٹرڈ 1000 روپے
(زر تعاون بذریعہ منی آرڈر)

بیرون ملک
سالانہ 50 ڈالر

فہرست

شذرات
’سنت‘ اور ’ملت ابراہیم‘ کا باہمی تعلق: جناب جاوید احمد غامدی کے موقف کا تقابلی مطالعہ (۲) — سید منظور الحسن — ۴

قرآنیات
البیان: الشعراء ۲۶: ۱۹۲-۲۲۷ (۴) — جاوید احمد غامدی — ۱۷

معارف نبوی
عذاب قبر (۳) — جاوید احمد غامدی / ڈاکٹر محمد عامر گزدر — ۲۵

مقالات
”میزان“ ---- توضیحی مطالعہ (۴) — محمد عمار خان ناصر — ۴۱

نقطۂ نظر
کائنات کا آغاز وارتقا: قرآنی بیانات اور سائنسی حقائق کے درمیان تطبیق کی راہ (۲) — ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی — ۵۵

سیر و سوانح
حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ (۱) — محمد وسیم اختر مفتی — ۶۸

اصلاح و دعوت
وقت اور صحت — محمد ذکوان ندوی — ۸۰

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
www.ghamidi.net, www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
http://www.javedahmadghamidi.com/index.php/ishraq

شذرات

سید منظور الحسن

'سنت' اور 'ملت ابراہیم' کا باہمی تعلق

جناب جاوید احمد غامدی کے موقف کا تقابلی مطالعہ

(۲)

جناب جاوید احمد غامدی کے تصور سنت پر یہ اعتراض بھی کیا گیا ہے کہ سورۂ نحل (۱۶) کے الفاظ 'اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا' کی تفسیر میں اُن کی یہ بات درست نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دین ابراہیمی کی اتباع کا حکم دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ملت کے احکام محفوظ ہی نہیں تھے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی اتباع کا حکم کیونکر دیا جا سکتا تھا! جہاں تک ملت ابراہیم کی اتباع کے قرآنی حکم کا تعلق ہے تو اس سے مراد عملی احکام نہیں، بلکہ دین کی اساسی تعلیمات اور اصولی تصورات ہیں۔

گذشتہ بحث میں یہ بات ہر لحاظ سے واضح ہو گئی ہے کہ ملت ابراہیمی سے مراد دین ابراہیمی ہے اور اس کے مشمولات میں فقط اصولی تصورات نہیں، بلکہ احکام و اعمال بھی شامل ہیں۔ اس تناظر میں مذکورہ اعتراض کے بارے میں ہماری معروضات حسب ذیل نکات پر مبنی ہیں:

اولاً، اس اعتراض کی تردید خود آیت کے اسلوب بیان سے ہو جاتی ہے۔ حکم دیا گیا ہے: 'وَاتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ'، یعنی ملت ابراہیم کی پیروی کرو۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ اپنے پیغمبر کو یا اپنے بندوں کو کسی ایسی چیز کا حکم دیں جس کا وجود عنقا ہو، جو غیر محفوظ ہو یا جس کا مصداق مشتبہ ہو۔ اس ضمن میں دلیل قاطع یہ ہے کہ آیت کے

اولین مخاطب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ عامۂ عرب کو ملت ابراہیم کے مختلف احکام کے بارے میں ابہام یا اشکال ہو، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ ہرگز ممکن نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو اللہ کے احکام کی تفہیم کے لیے وحی کی مکمل رہنمائی میسر تھی۔ چنانچہ یہ یقینی امر ہے کہ آپ ان سنن کی حقیقی صورتوں سے بھی آگاہ تھے اور ان سے متعلق بدعات اور تحریفات کو بھی پوری طرح جانتے تھے۔

ثانیاً، قرآن مجید میں مختلف سنن کا جس طریقے سے ذکر ہوا ہے، اس سے بھی یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ دین ابراہیمی کے سنن اہل عرب میں پوری طرح معلوم و متعارف تھے۔ عرب جاہلی میں دین ابراہیمی کے سنن کوئی اجنبی چیز نہیں تھے۔ ان کی زبان میں صلوٰۃ، صوم، زکوٰۃ، حج، نسک کے الفاظ کا وجود بجاے خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ان عبادات سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ ان کی مذہبی حیثیت، ان کے آداب، ان کے اعمال و اذکار اور حدود و شرائط کو بھی بہت حد تک جانتے تھے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ قرآن نے جب ان کا ذکر کیا تو ایسے ہی کیا، جیسے کسی معلوم و معروف چیز کا ذکر کیا جاتا ہے۔ نہ ان کی نوعیت اور ماہیت بیان کی اور نہ ان کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دین ابراہیمی کی ایک روایت کی حیثیت سے یہ جس طرح انجام دی جاتی تھیں، وحی کی رہنمائی میں ان میں بعض ترامیم کر کے، ان میں کیے جانے والے انحرافات کو ختم کر کے اور ان کی بدعات کی اصلاح کر کے انھیں اپنے ماننے والوں کے لیے جاری فرمایا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ثالثاً، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بنی اسمٰعیل میں دین ابراہیمی کی جو روایت رائج تھی، اس میں انھوں نے بعض تحریفات کر رکھی تھیں اور بعض بدعات اختراع کر لی تھیں، لیکن یہ بات ثابت شدہ ہے کہ ان تحریفات اور بدعات کا تحریف اور بدعت ہونا پوری طرح مسلم تھا، یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے بھی انھیں اختیار نہیں کیا[۱]۔ مزید برآں نبوت کے بعد ان تحریفات کی نشان دہی اور ان بدعات سے آگاہی کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کی رہنمائی بھی میسر ہو گئی۔ اس تناظر میں بالبداہت واضح ہے کہ جب اللہ تعالیٰ

۱۔ حج و عمرہ کے حوالے سے یہ بات پوری طرح مسلم ہے۔ اہل عرب نہ صرف اس کے مناسک اور رسوم و آداب سے آگاہ تھے، بلکہ ان بدعتوں کے بارے میں بھی پوری طرح متنبہ تھے جو انھوں نے اس کے مراسم میں شامل کر رکھی تھیں۔ روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ایک حج کے موقع پر جبیر بن مطعم آپ کو میدان عرفات میں دیکھ کر حیران ہوا۔ اسے تعجب ہوا کہ قریش کے لوگ تو مزدلفہ سے آگے نہیں جاتے، جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وقوف عرفہ کے لیے یہاں حاضر ہیں (بخاری، رقم ۱۶۶۴)۔

نے آپ کو سنت ابراہیمی کی پیروی کا حکم دیا تو اس میں کسی طرح کا کوئی ابہام نہیں تھا۔

رابعًا، مذکورہ اعتراض اگر حفاظت ہی کے پہلو سے ہے تو سوال یہ ہے کہ ''ملت ابراہیم'' کا جو مفہوم و مصداق اس اعتراض میں متعین کیا ہے، یعنی توحید، شرک سے اجتناب اور اطاعت الٰہی، کیا یہ تصورات مشرکین عرب کے ہاں محفوظ اور تحریف و آمیزش سے پاک تھے؟ ہر شخص جانتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ چنانچہ ہر صاحب علم اس کے جواب میں یہی کہے گا کہ بلاشبہ مشرکین نے ان تصورات میں تحریف و آمیزش کر رکھی تھی، لیکن وہ اس آمیزش سے بھی پوری طرح آگاہ تھے اور اصل تصورات کو بھی بخوبی جانتے تھے۔ بعینہٖ یہی معاملہ اعمال کا بھی ہے۔ وہ ان اعمال کی اصل سے بھی واقف تھے اور ان کے محرفات کو بھی جانتے تھے۔

یہ نکات امید ہے کہ قارئین کے اطمینان کے لیے کافی ہوں گے۔ مزید تاکید کے لیے اہل علم کی تالیفات کے چند اقتباس درج ذیل ہیں۔ ان کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ تمام احکام جنھیں غامدی صاحب نے دین ابراہیمی کی روایت قرار دے کر سنن کی فہرست میں شمار کیا ہے، ہمارے جلیل القدر علما بھی انھیں دین ابراہیمی کی مستند روایت کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے دین اسلام کے پس منظر کے حوالے سے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں بیان کیا ہے کہ اصل دین ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے۔ تمام انبیا نے بنیادی طور پر ایک ہی جیسے عقائد اور ایک ہی جیسے اعمال کی تعلیم دی ہے۔ شریعت کے احکام اور ان کی بجا آوری کے طریقوں میں حالات کی ضرورتوں کے لحاظ سے، البتہ کچھ فرق رہا ہے۔ سرزمین عرب میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو اس موقع پر اس دین کے احوال یہ تھے کہ صدیوں کے تعامل کے نتیجے میں اس کے احکام دینی مسلمات کی حیثیت اختیار کر چکے تھے اور ملت ابراہیم کے طور پر پوری طرح معلوم و معروف تھے، تاہم بعض احکام میں تحریفات اور بدعات داخل ہو گئی تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہوا: 'اتَّبِعۡ مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا'، یعنی ملت ابراہیم کی پیروی کرو۔ آپ نے یہ پیروی اس طریقے سے کی کہ اس ملت کے معلوم و معروف احکام کو برقرار رکھا، بدعات کا قلع قمع کیا اور تحریف شدہ احکام کو ان کی اصل صورت پر بحال فرمایا۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

أصل الدين واحد اتفق عليه الأنبياء عليهم السلام، وإنما الاختلاف في الشرائع والمناهج. تفصيل ذالک أنه	''اصل دین ایک ہے، سب انبیا علیہم السلام نے اسی کی تبلیغ کی ہے۔ اختلاف اگر ہے تو فقط شرائع اور مناہج میں ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ سب

أجمع الأنبياء عليهم السلام على توحيد الله تعالى عبادة واستعانة، ... وأنه قدر جميع الحوادث قبل أن يخلقها، وأن لله ملائكة لا يعصونه فيما أمر، ويفعلون ما يؤمرون، وأنه ينزل الكتاب على من يشاء من عباده، ويفرض طاعته على الناس، وأن القيامة حق، والبعث بعد الموت حق، والجنة حق، والنار حق. وكذالک أجمعوا على أنواع البر من الطهارة والصلٰوة والزكٰوة والصوم والحج والتقرب إلى الله بنوافل الطاعات من الدعاء والذكر وتلاوة الكتاب المنزل من الله، وكذالک أجمعوا إلى النكاح وتحريم السفاح وإقامة العدل بين الناس وتحريم المظالم وإقامة الحدود على أهل المعاصي والجهاد مع أعداء الله والاجتهاد في إشاعة أمر الله ودينه، فهذا أصل الدين، ولذالک لم يبحث القرآن العظيم عن لمية هذه الأشياء إلا ما شاء الله، فإنها مسلمة فيمن نزل القرآن على ألسنتهم. وإنما الاختلاف في صور هذه الأمور وأشباحها.

(۱۹۹/۱-۲۰۰)

انبیا نے متفق الکلمہ ہو کر یہ تعلیم دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید دین کا بنیادی پتھر ہے۔ عبادت اور استعانت میں کسی دوسری ہستی کو اس کا شریک نہ ٹھیرایا جائے۔... ان کا یہ پختہ عقیدہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے سب حوادث اور واقعات کو وقوع سے پہلے ازل میں مقدر کیا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک پاک مخلوق ہے جس کو ملائکہ کہتے ہیں۔ وہ کبھی اس کے حکم سے سرتابی نہیں کرتے اور اس کے احکام کی اسی طرح تعمیل کرتے ہیں، جس طرح ان کو حکم ہوتا ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے کسی ایک کو چن لیتا ہے جس پر وہ اپنا کلام نازل فرماتا ہے اور لوگوں پر اس کی اطاعت فرض کر دیتا ہے۔ موت کے بعد زندہ ہونا اور قیامت کا قائم ہونا حق ہے، جنت اور دوزخ کا ہونا حق ہے۔ جس طرح ہر دین کے عقائد ایک ہیں، اسی طرح بنیادی نیکیاں بھی ایک جیسی ہیں۔ چنانچہ دین میں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے، طہارت، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ نوافل عبادات کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں قرب حاصل کرنے کی تعلیم ہر دین میں موجود ہے۔ مثلاً مرادوں کے پورا ہونے کے لیے دعا مانگنا، اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رہنا، نیز کتاب منزل کی تلاوت کرنا۔ اس بات پر بھی تمام انبیا علیہم السلام کا اتفاق ہے کہ

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

نکاح جائز اور سفاح[۲] حرام اور ناجائز ہے۔ جو حکومت دنیا میں قائم ہو عدل اور انصاف کی پابندی کرنا اور کم زوروں کو ان کے حقوق دلانا اس کا فرض ہے۔ اسی طرح یہ بھی اس کا فرض ہے کہ مظالم اور جرائم کے ارتکاب کرنے والوں پر حد نافذ کرے، دین اور اس کے احکام کی تبلیغ اور اشاعت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے۔ یہ دین کے وہ اصول ہیں جن پر تمام ادیان کا اتفاق ہے اور اس لیے تم دیکھو گے کہ قرآن مجید میں ان باتوں کو مسلمات مخاطبین کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور ان کی لمیت سے بحث نہیں کی گئی۔ مختلف ادیان میں اگر اختلاف ہے تو وہ فقط ان احکام کی تفاصیل اور جزئیات اور طریق ادا سے متعلق ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

واعلم أن النبوة كثيرًا ما تكون من تحت الملة كما قال الله تعالٰى: ﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ﴾ وكما قال: ﴿وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ﴾ وسر ذالک أنه تنشأ قرون كثيرة على التدين بدين. وعلى تعظيم شعائره. وتصير أحكامه من المشهورات الذائعة اللاحقة بالبديهيات الأولية التي لا تكاد تنكر. فتجئ نبوة أخرى لإقامة ما أعوج منها؛ وصلاح

''ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ملا: 'اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا' اور آپ کی امت کو ان الفاظ سے مخاطب کیا گیا: 'مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ'۔ اسی طرح سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے حق میں فرمایا: 'وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ'۔ اس کا راز اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب کسی دین پر بہت صدیاں گزر جاتی ہیں اور اس اثنا میں لوگ اس کی پابندی اور اس کے شعائر کی تعظیم اور احترام میں مشغول رہتے ہیں تو اس کے احکام اس

۲۔ 'سفاح' کا لفظ نکاح کے مقابل میں ہے، اس کے معنی ناجائز طریقے سے صنفی خواہش پوری کرنے کے ہیں۔

ما فسد منها بعد اختلاط رواية نبيها، فتفتش عن الأحكام المشهورة عندهم، فما كان صحيحًا موافقًا لقواعد السياسة الملية لا تغيره، بل تدعو إليه، وتحث عليه، وما كان سقيمًا قد دخله التحريف، فإنها تغيره بقدر الحاجة، وما كان حريًا أن يزداد، فإنها تزيده على ما كان عندهم. (۲۰۹/۱)

قدر شائع وذائع ہو جاتے ہیں کہ ان کو بدیہیات اور مشہورات مسلمہ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے اور کسی کو بھی ان سے انکار کرنے کی جرأت نہیں ہوتی، لیکن ساتھ ہی اس کے احکام میں طرح طرح کا تغیر و تبدل اور اس کی تعلیمات میں مختلف النوع تحریفات بھی آ جاتی ہیں اور بعض بری رسوم بھی رواج پا جاتی ہیں۔ چنانچہ ان رسوم کی اصلاح اور ان تحریفات کا قلع قمع کرنے کے لیے ایک نبی کی ضرورت ہوتی ہے اور جب وہ مبعوث ہو چکتا ہے تو اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ جو احکام اس قوم میں جس کی طرف وہ مبعوث ہوا ہے، شائع وذائع ہیں، ان پر وہ ایک نظر غائر ڈالتا ہے جو احکام سیاست ملیہ کے اصول کے مطابق ہوتے ہیں، ان کو برقرار رکھتا ہے اور لوگوں کو ان کے پابند رہنے کی ترغیب دیتا اور تاکید کرتا ہے، برخلاف اس کے کہ جن میں تحریف آ چکی ہے، ان کو بدل کر اپنی اصل صورت پر لاتا ہے اور جن احکام میں ہنگامی مصلحت کے لحاظ سے کچھ کمی بیشی کرنا مطلوب ہو، ان میں وقتی مصالح کے تقاضوں کے مطابق تغیر و تبدل کر دیتا ہے۔‘‘

شاہ صاحب نے ملت ابراہیمی کے حوالے سے اسی بات کو ایک دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

فاعلم أنه ﷺ بعث بالملة الحنيفية الإسماعيلية لإقامة عوجها وإزالة تحريفها وإشاعة نورها، وذالک قوله

’’اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ملت حنیفیہ اسماعیلیہ کی کجیاں درست کرنے اور جو تحریفات اس میں واقع ہوئی تھیں، ان کا ازالہ کر کے ملت مذکورہ

تعالٰی: ﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ﴾ ولما كان الأمر على ذالک وجب أن تكون أصول تلك الملة مسلمة، وسنتها مقررة إذ النبي إذا بعث إلى قوم فيهم بقية سنة راشدة، فلا معنى لتغييرها وتبديلها، بل الواجب تقريرها، لأنه أطوع لنفوسهم وأثبت عند الاحتجاج عليهم.

(حجۃ اللہ البالغہ ۱/ ۴۲۷)

کو اپنے اصلی رنگ میں جلوہ گر کرنے کے لیے مبعوث فرمایا تھا۔ چنانچہ: 'مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ' (اور 'اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا') میں اسی حقیقت کا اظہار ہے، اس لیے یہ ضروری تھا کہ ملت ابراہیم کے اصول کو محفوظ رکھا جائے اور ان کی حیثیت مسلمات کی ہو۔ اسی طرح جو سنتیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قائم کی تھیں، ان میں اگر کوئی تغیر نہیں آیا تو ان کا اتباع کیا جائے۔ جب کوئی نبی کسی قوم میں مبعوث ہوتا ہے تو اس سے پہلے نبی کی شریعت کی سنت راشدہ ایک حد تک ان کے پاس محفوظ ہوتی ہے جس کو بدلنا غیر ضروری، بلکہ بے معنی ہوتا ہے۔ قرین مصلحت یہی ہے کہ اس کو واجب الاتباع قرار دیا جائے، کیونکہ جس سنت راشدہ کو وہ لوگ پہلے بہ نظر استحسان دیکھتے ہیں، اسی کی پابندی پر مامور کیا جائے تو کچھ شک نہیں کہ وہ اس کو قبول کرنے میں ذرہ بھی پس و پیش نہیں کریں گے اور اگر کوئی اس سے انحراف یا سرتابی کرے تو اس کو زیادہ آسانی سے قائل کیا جا سکے گا، کیونکہ وہ خود اس کے مسلمات میں سے ہے۔''

یہ بات بھی اہل علم کے ہاں پوری طرح مسلم ہے کہ دین ابراہیمی کے سنن عربوں میں قبل از اسلام رائج تھے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ عرب نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اعتکاف، قربانی، ختنہ، وضو، غسل، نکاح اور تدفین کے احکام پر دین ابراہیمی کی حیثیت سے عمل پیرا تھے۔ ان احکام کے لیے شاہ صاحب نے 'سنة' (سنت)، 'سنن متأكدة' (موکد سنتیں)، 'سنة الأنبياء' (انبیا کی سنت) اور 'شعائر الملة

الحنيفية‘(ملت ابراہیمی کے شعار) کی تعبیرات اختیار کی ہیں:

وكان من المعلوم عندهم أن كمال الإنسان أن يسلم وجهه لربه، ويعبده أقصى مجهوده. وأن من أبواب العبادة الطهارة، وما زال الغسل من الجنابة سنة معمولة عندهم، وكذالک الختان وسائر خصال الفطرة، وفي (التوراة) أن الله تعالىٰ جعل الختان ميسمة على إبراهيم وذريته. وهذا الوضوء يفعله المجوس واليهود وغيرهم، وكانت تفعله حكماء العرب. وكانت فيهم الصلٰوة، وكان ”أبو ذر“ رضي الله عنه يصلي قبل أن يقدم على النبي صلى الله عليه وسلم بثلاث سنين، وكان ”قس بن ساعدة الأيادي“ يصلي، والمحفوظ من الصلٰوة في أمم اليهود والمجوس وبقية العرب أفعال تعظيمية لا سيما السجود وأقوال من الدعاء والذكر. وكانت فيهم الزكاة... وكان فيهم الصوم من الفجر إلى غروب الشمس، وكانت قريش تصوم عاشوراء في الجاهلية. وكان الجوار في المسجد، وكان ”عمر“ نذر اعتكاف ليلة في الجاهلية، فاستفتى في ذالک رسول الله

”یہ بات وہ سب (عرب) جانتے تھے کہ انسان کا کمال اور اس کی سعادت اس میں ہے کہ وہ اپنا ظاہر اور باطن کلیتاً اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے اور اس کی عبادت میں اپنی انتہائی کوشش صرف کرے۔ طہارت کو وہ عبادت کا جز سمجھتے تھے اور جنابت سے غسل کرنا ان کا معمول تھا۔ ختنہ اور دیگر خصال فطرت کے وہ پابند تھے۔ تورات میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام اور اس کی اولاد کے لیے ختنہ کو ایک شناخت کی علامت مقرر کیا۔ یہودیوں اور مجوسیوں وغیرہ میں بھی وضو کرنے کا رواج تھا اور حکماے عرب بھی وضو اور نماز عمل میں لایا کرتے تھے۔ ابوذر غفاری اسلام میں داخل ہونے سے تین سال پہلے، جب کہ ابھی ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نیاز حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا تھا، نماز پڑھا کرتے تھے۔ اسی طرح قس بن ساعدہ ایادی کے بارے میں منقول ہے کہ وہ نماز پڑھا کرتے تھے۔ یہود اور مجوس اور اہل عرب جس طریقے پر نماز پڑھتے تھے، اس کے متعلق اس قدر معلوم ہے کہ ان کی نماز افعال تعظیمیہ پر مشتمل ہوتی تھی جس کا جزو اعظم سجود تھا۔ دعا اور ذکر بھی نماز کے اجزا تھے۔ نماز کے علاوہ دیگر احکام ملت بھی ان میں رائج تھے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

صلى الله عليه وسلم... وأما حج بيت الله وتعظيم شعائره والأشهر الحرم... ولم تزل سنتهم الذبح في الحلق والنحر في اللبة ما كانوا يخنقون، ولا يبعجون. ... وكانت لهم سنن متأكدة يتلاومون على تركها في مأكلهم ومشربهم ولباسهم وولائمهم وأعيادهم ودفن موتاهم ونكاحهم وطلاقهم وعدتهم وإحدادهم، وبيوعهم ومعاملاتهم، وما زالوا يحرمون المحارم كالبنات والأمهات والأخوات وغيرها. وكانت لهم مزاجر فى مظالمهم كالقصاص والديات والقسامة وعقوبات على الزنا والسرقة.

(حجۃ اللہ البالغہ ۱/ ۲۹۰-۲۹۲)

مثلاً زکوٰۃ وغیرہ۔... صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے پینے اور صنفی تعلق سے محترز رہنے کو روزہ خیال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ عہد جاہلیت میں قریش عاشور کے دن روزہ رکھنے کے پابند تھے۔ اعتکاف کو بھی وہ عبادت سمجھتے تھے۔ حضرت عمر کا یہ قول کتب حدیث میں منقول ہے کہ انھوں نے زمانۂ جاہلیت میں ایک دن کے لیے اعتکاف میں بیٹھنے کی منت مانی تھی جس کا حکم انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔... اور یہ تو خاص وعام جانتے ہیں کہ سال بہ سال بیت اللہ کے حج کے لیے دور دور سے ہزاروں کی تعداد میں مختلف قبائل کے لوگ آتے تھے۔... ذبح اور نحر کو بھی وہ ضروری سمجھتے تھے۔ جانور کا گلا نہیں گھونٹ دیتے تھے یا اسے چیرتے پھاڑتے نہیں تھے۔ اسی طرح اشہر الحرم کی حرمت ان کے ہاں مسلم تھی۔... ان کے ہاں دین مذکور کی بعض ایسی مؤکد سنتیں ماثور تھیں جن کے ترک کرنے والے کو مستوجب ملامت قرار دیا جاتا تھا۔ اس سے مراد کھانے پینے، لباس، عید اور ولیمہ، نکاح اور طلاق، عدت اور احداد، خرید وفروخت، مردوں کی تجہیز و تکفین وغیرہ کے متعلق آداب اور احکام ہیں جو حضرت ابراہیم سے ماثور ومنقول تھے اور جن پر ان کی لائی ہوئی شریعت مشتمل تھی۔ ان سب کی وہ

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

پابندی کرتے تھے۔ ماں بہن اور دیگر محرمات سے نکاح کرنا اسی طرح حرام سمجھتے تھے، جیسا کہ قرآن کریم میں مذکور ہے۔ قصاص اور دیت اور قسامت کے بارے میں بھی وہ ملت ابراہیمی کے احکام پر عامل تھے۔اور حرام کاری اور چوری کے لیے سزائیں مقرر تھیں۔"

والذبح والنحر سنة الأنبياء عليهم السلام توارثوهما وفيهما مصالح... منها أنه صار ذالک أحد شعائر الملة الحنيفية يعرف به الحنيفي من غيره فكان بمنزلة الختان وخصال الفطرة فلما بعث النبي صلى الله عليه وسلم مقيمًا للملة الحنيفية وجب الحفظ عليه.

(حجۃ اللہ البالغہ ۲/۳۱۹-۳۲۰)

"انبیا علیہم السلام کی سنت ذبح اور نحر ہے جو ان سے متوارث چلی آئی ہے۔... ذبح اور نحر دین حق کے شعائر میں سے ہے اور وہ حنیف اور غیر حنیف میں تمیز کرنے کا ذریعہ ہے، اس لیے یہ بھی اسی طرح کی ایک سنت ہے، جس طرح کہ ختنہ اور دیگر خصال فطرت ہیں اور جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو خلعت نبوت سے سرفراز فرما کر دنیا میں ہدایت کے لیے بھیجا گیا تو آپ کے دین میں اس سنت ابراہیمی کو دین حنیفی کے شعار کے طور پر محفوظ رکھا گیا۔"

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

امام رازی نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ عربوں میں حج اور ختنہ وغیرہ کو دین ابراہیمی ہی کی حیثیت حاصل تھی:

ومعلوم أنه عليه السلام أتى بشرائع مخصوصة، من حج البيت والختان وغيرهما... وكان العرب تدين بهذه الأشياء.(التفسير الكبير ۴/۱۸)

"اور یہ بات معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت خاص تھی، جیسے بیت اللہ کا حج اور ختنہ وغیرہ... عربوں نے ان چیزوں کو دین کی حیثیت سے اختیار کر رکھا تھا۔"

ختنہ کی سنت کے حوالے سے ابن قیم نے لکھا ہے کہ اس کی روایت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے

لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک بلا انقطاع جاری رہی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم دین ابراہیمی کی تکمیل اور توثیق کے لیے مبعوث ہوئے:

قال الموجبون: الختان علم الحنيفية وشعار الإسلام ورأس الفطرة وعنوان الملة.... وعليه استمر عمل الحنفاء من عهد إمامهم إبراهيم إلى عهد خاتم الأنبياء فبعث بتكميل الحنيفية وتقريرها لا بتحويلها وتغييرها.

(مختصر تحفۃ المولود ۱۰۳-۱۰۴)

”ختنہ کو واجب کہنے والوں کا قول ہے کہ یہ دین ابراہیمی کی علامت، اسلام کا شعار، فطرت کی اصل اور ملت کا عنوان ہے۔... دین ابراہیمی کی اتباع کرنے والے اپنے امام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے لے کر خاتم الانبیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد تک ہمیشہ اسی پر کاربند رہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم دین ابراہیمی کی تکمیل اور توثیق کے لیے مبعوث فرمائے گئے، نہ کہ اس میں تغیر و تبدل کرنے کے لیے۔“

قبل از اسلام تاریخ کے محقق ڈاکٹر جواد علی نے اپنی کتاب ”المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام“ میں کم و بیش ان تمام سنن کو دین ابراہیمی کے طور پر نقل کیا ہے جنھیں جناب جاوید احمد غامدی نے سنتوں کی فہرست میں جمع کیا ہے اور جو عربوں میں اسلام سے پہلے رائج تھیں۔ اس ضمن میں فاضل محقق نے نماز، روزہ، اعتکاف، حج و عمرہ، قربانی، جانوروں کا تذکیہ، ختنہ، مونچھیں پست رکھنا، زیر ناف کے بال کاٹنا، بغل کے بال صاف کرنا، بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا، ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی، استنجا، میت کا غسل، تجہیز و تکفین اور تدفین کے بارے میں واضح کیا ہے کہ یہ سنن دین ابراہیم کے طور پر رائج تھیں اور عرب، بالخصوص قریش ان پر کاربند تھے۔ لکھتے ہیں:

وعامة ولد (معد) بن عدنان على بعض دين إبراهيم، يحجون البيت ويقيمون المناسك، ويقرون الضيف ويعظمون الأشهر الحرم، وينكرون الفواحش والتقاطع والتظالم، ويعاقبون على الجرائم. فأدخل في الدين أمورًا نعدها اليوم من

”بنو معد بن عدنان دین ابراہیمی کے بعض اجزا پر کار فرما تھے۔ وہ بیت اللہ کا حج کرتے تھے اور اس کے مناسک ادا کرتے تھے۔ مہمان نواز تھے، حرمت والے مہینوں کی تعظیم کرتے تھے۔ فواحش، قطع رحمی اور ایک دوسرے کے ساتھ ظلم و زیادتی کو برا جانتے تھے۔ جرائم کی صورت میں سزا بھی

الاعراف وقواعد الأخلاق والسلوک، وجعلها من سنة إبراهيم، أي دين العرب القديم قبل إفساده بالتعبد للأصنام. (٣۴٥/٦)

ويذكر أهل الأخبار أن قريشًا كانت تصوم يوم عاشوراء... وذكر أن رسول الله كان يصوم عاشوراء في الجاهلية. (٣٣٩/٦)

وقد نسب الاعتكاف في الكهوف وفي البراري وفي الجبال إلى عدد من هؤلاء الحنفاء. فقد ذكر أهل الأخبار أنهم كانوا قد اعتكفوا في المواضع الخالية البعيدة عن الناس، وحبسوا أنفسهم فيها، فلا يخرجون منها إلا لحاجة شديدة وضرورة ماسة. يتحنثون فيها ويتأملون في الكون، يلتمسون الصدق والحق.(٥٠٩/٦)

وقد كان الحنفاء من النساک أي المتعبدين. وعدوا الذبائح من النسک. وجعلوا النسيكة: الذبيحة. والذبائح، أي النسائک، هي من أهم مظاهر التعبد والزهد عند الجاهليين.(٥١٠/٦)

دیتے تھے۔ یہی چیزیں ہیں جنھیں آج ہم رسم ورواج اور اخلاقی اصول وضوابط میں شمار کرتے ہیں۔ یہی امور سنت ابراہیمی تھے، یعنی بت پرستی سے پہلے عربوں کا قدیم دین۔‘‘

’’روایتوں میں ہے کہ قریش یوم عاشور کا روزہ رکھتے تھے۔... روایتوں میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نبوت سے پہلے یہ روزہ رکھتے تھے۔‘‘

’’اعتکاف کی نسبت دین ابراہیمی کے متبعین کی طرف کی جاتی ہے جو پہاڑوں، غاروں اور غیر آباد جگہوں میں اس کا اہتمام کرتے تھے۔ اہل اخبار بیان کرتے ہیں کہ وہ ویران اور آبادی سے دور مقامات پر اعتکاف کیا کرتے تھے۔ ان جگہوں میں وہ اپنے آپ کو بند رکھتے اور شدید حاجت اور ضروری کام کے علاوہ باہر نہیں نکلتے تھے۔ ان میں عبادت کرتے، کائنات میں غور وفکر کرتے، سچ اور حق کے لیے دعا کرتے۔‘‘

’’دین ابراہیمی کے پیرو نساک، یعنی عبادت گزاروں میں سے تھے۔ وہ قربانی کے جانور کو بھی ’نسک‘ میں شمار کرتے تھے اور وہ ’’نسیکہ‘‘ سے مراد ’’ذبیحہ‘‘ لیتے تھے۔ قربانی کے جانور، یعنی نسائک زمانۂ جاہلیت کے لوگوں کے نزدیک زہد وعبادت کے اہم مظاہر میں سے تھے۔‘‘

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

وذكر أنهم كانوا يصلون على موتاهم، وكانت صلاتهم أن يحمل الميت على سرير، ثم يقوم وليه، فيذكر محاسنه كلها ويثني عليه. ثم يقول: عليك رحمة الله. ثم يدفن.(۶/۳۳۷)

”بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنے مردوں پر صلٰوۃ پڑھتے تھے۔ ان کی نماز جنازہ یہ تھی کہ میت کو کھاٹ پر لٹا دیا جاتا، پھر اس کا ولی کھڑا ہوتا اور اس کے تمام محاسن بیان کرتا اور اس کی مدح و ثنا کرتا۔ پھر کہتا: تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔ پھر اس کو دفن کر دیا جاتا۔“

وأما الاغتسال من الجنابة وتغسيل الموتى، فمن السنن التي أقرت في الإسلام، وقد أشير إلى غسل الميت في شعر للأفوه الأودي. وأشير إلى تكفين الموتى والصلٰوة عليهم في أشعار منسوبة إلى الأعشى وإلى بعض الجاهليين. وورد أن قريشًا كانت تغسل موتاها وتحنطهم.(۶/۳۴۴)

”غسل جنابت اور مردوں کو نہلانا بھی ان سنتوں میں سے ہے جو اسلام میں مقرر کی گئیں۔ افوہ اودی کے شعر میں غسل میت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اعشیٰ اور بعض جاہلی شعرا کی طرف منسوب اشعار میں مردوں کے کفن اور ان پر نماز پڑھنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ روایتوں میں ہے کہ قریش اپنے مردوں کو غسل دیتے اور خوشبو لگاتے تھے۔“

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ويذكر أهل الاخبار أنه كان لأتباع إبراهيم من العرب علامات وعادات ميزوا أنفسهم بها عن غيرهم، منها: الختان، وحلق العانة، وقص الشارب... ومن سنن شريعة إبراهيم الاختتان. وهو من العادات القديمة الشائعة بين العرب الجاهليين الوثنيين.(۶/۵۰۸)

”اہل اخبار بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متبعین کی کچھ ایسی علامات اور عادات تھیں، جن کی وجہ سے وہ دوسروں سے ممتاز تھے۔ ان میں سے ختنہ، زیر ناف بال کاٹنا اور مونچھیں ترشوانا... ختنہ شریعت ابراہیم کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ یہ ان قدیم عادات میں سے ہے جو زمانۂ جاہلیت کے بت پرستوں میں عام تھیں۔“

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الشعراء

(۴)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

وَاِنَّهٗ لَتَنۡزِيۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۹۲﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوۡحُ الۡاَمِيۡنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلۡبِكَ
لِتَكُوۡنَ مِنَ الۡمُنۡذِرِيۡنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِىٍّ مُّبِيۡنٍ ﴿۱۹۵﴾ وَاِنَّهٗ لَفِىۡ زُبُرِ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۱۹۶﴾

(یہ پہلوں کی سرگذشتیں ہیں۔ اِس کتاب کے منکرین بھی یہی کر رہے ہیں، اِس لیے مطمئن رہو)، اِس میں کچھ شک نہیں کہ یہ نہایت اہتمام سے خداوند عالم کا اتارا ہوا کلام ہے[۱۹۲]۔ اِس کو تمھارے دل پر روح الامین[۱۹۳] لے کر اترا ہے[۱۹۴]، اِس لیے کہ دوسرے پیغمبروں کی طرح تم بھی خبردار کرنے

۱۹۲۔ یعنی قرآن مجید۔ اِس کے لیے ضمیر مرجع کے بغیر اِس لیے آگئی ہے کہ سیاق کلام اِسے واضح کر رہا ہے۔

۱۹۳۔ یہ جبریل علیہ السلام کا لقب ہے جس سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ جو کچھ اُن کے حوالے کیا جاتا ہے، اُسے وہ پوری دیانت داری کے ساتھ بے کم و کاست اور بغیر کسی ادنیٰ تبدیلی کے پہنچاتے ہیں۔

۱۹۴۔ یعنی براہ راست تمھارے دل پر جس کے بعد کسی آمیزش کی گنجایش نہیں ہو سکتی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... آیت میں خطاب ظاہر الفاظ کے اعتبار سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے، لیکن کلام کا

اَوَلَمۡ یَکُنۡ لَّهُمۡ اٰیَۃً اَنۡ یَّعۡلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ﴿۱۹۷﴾
وَلَوۡ نَزَّلۡنٰهُ عَلٰی بَعۡضِ الۡاَعۡجَمِیۡنَ ﴿۱۹۸﴾ فَقَرَاَهٗ عَلَیۡهِمۡ مَّا کَانُوۡا بِهٖ مُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۹۹﴾
کَذٰلِکَ سَلَکۡنٰهُ فِیۡ قُلُوۡبِ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۲۰۰﴾ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ حَتّٰی یَرَوُا الۡعَذَابَ
الۡاَلِیۡمَ ﴿۲۰۱﴾ فَیَاۡتِیَهُمۡ بَغۡتَۃً وَّهُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۲۰۲﴾ فَیَقُوۡلُوۡا هَلۡ نَحۡنُ مُنۡظَرُوۡنَ ﴿۲۰۳﴾

والے بنو، نہایت صاف عربی زبان میں ـــــ اور یہ اگلے صحیفوں میں بھی مذکور ہے[۱۹۵]۔ کیا اِن لوگوں کے لیے یہ کوئی نشانی نہیں ہے کہ اِس کو بنی اسرائیل کے علما جانتے ہیں؟ ۱۹۲-۱۹۷

(یہ اب بھی نہیں مان رہے)، اور اگر ہم اِس کو کسی عجمی پر نازل کر دیتے، پھر وہ اِنھیں پڑھ کر اِسے سناتا تو یہ پھر بھی اِس پر ایمان نہ لاتے۔ اِن مجرموں کے دلوں میں اِسی طرح ہم نے اِسے گزارا ہے[۱۹۶]۔ یہ اِسے نہیں مانیں گے، جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں کہ وہ اچانک اِن پر آجائے اور اِنھیں خبر بھی نہ ہو، پھر اُس وقت کہیں کہ کیا ہمیں کچھ مہلت ملے گی؟ ۱۹۸-۲۰۳

مقصود مخالفین پر اِس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ یہ کلام پاک منبع سے نکلا ہے، پاک ذریعے سے اترا ہے اور پاک ترین محل میں اِس نے اپنا مستقر بنایا ہے۔" (تدبر قرآن ۵/۵۵۸)

۱۹۵۔ یہ اُن پیشین گوئیوں کا حوالہ ہے جو قرآن سے متعلق انبیاے سابقین کے صحیفوں میں موجود ہیں۔ آگے اُنھی کے پیش نظر فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل کے علما اُن سے واقف ہیں اور اُن میں سے خدا جنھیں توفیق دے گا، وہ اِس کی شہادت بھی دیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر قرآن جو دلائل پیش کرتا ہے، یہ اُن میں سے ایک اہم دلیل ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ پیغمبر کی حیثیت سے آپ لوگوں کے لیے کوئی اجنبی شخصیت نہیں تھے۔ اہل کتاب کے علما آپ کو اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب کو اُسی طرح پہچانتے تھے، جس طرح ایک مہجور باپ اپنے موعود و منتظر بیٹے کو پہچانتا ہے۔

۱۹۶۔ یعنی اِس طرح داخل کیا ہے کہ سنت الٰہی کے مطابق یہ اُس کو قبول کرنے سے اباہی کریں گے، اِس لیے کہ اپنی فطرت کو اِس بری طرح مسخ کر چکے ہیں کہ اِن کا معدہ اب اِس طرح کی کسی غذا کو قبول کرنے کے قابل نہیں رہا۔ چنانچہ انکار کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ تراش لیتے ہیں۔ اب اِس لیے نہیں مان رہے کہ تم اِنھی کے اندر سے ہو اور اگر باہر کا کوئی آدمی آکر اِسے سناتا تو یہ کہہ کر رد کر دیتے کہ اہل عرب کے لیے کوئی عجمی کیسے پیغمبر بنا کر بھیجا جا سکتا ہے؟

اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ﴿۲۰۵﴾ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا
كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ﴿۲۰۷﴾
وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ﴿۲۰۸﴾ ذِكْرٰى وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۰۹﴾
وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۰﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾ اِنَّهُمْ
عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾

تو کیا یہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں؟ ذرا دیکھو تو، اگر ہم (وہ عذاب ابھی نہ اتاریں اور) اِن کو چند سال اور (اِسی طرح) بہرہ مند رکھیں، پھر وہ عذاب اِن پر آجائے جس سے اِنھیں ڈرایا جا رہا ہے تو یہ بہرہ مندی اِن کے کس کام آئے گی؟[197] ۲۰۴-۲۰۷

(اِنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ مہلت اتمام حجت کے لیے ہے)۔ ہم نے کسی بستی کو بھی اِس کے بغیر ہلاک نہیں کیا کہ اُس کے لیے پہلے (اُن لوگوں کی) یاددہانی کے لیے خبردار کرنے والے آئے۔ اور ہم ظالم نہیں ہیں کہ اِس کے بغیر ہی اُنھیں ہلاک کر دیں۔ ۲۰۸-۲۰۹

(یہ خدا کا اتارا ہوا کلام ہے، اِس سے یاددہانی حاصل کرو)۔ اِسے شیاطین لے کر نہیں اترے ہیں۔ نہ یہ اُن کے لائق ہے، نہ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تو سن گن لینے ہی سے دور رکھے گئے ہیں[198]۔ ۲۱۰-۲۱۲

۱۹۷۔ مطلب یہ ہے کہ چند برسوں کی اِس مہلت نے اِنھیں غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے۔ اِنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ مہلت مصلحت الٰہی سے ہے۔ اِس سے یہ عذاب ہمیشہ کے لیے ٹل نہیں جائے گا۔ اِن کا رویہ یہی رہا تو اِسے بالآخر آنا ہے اور یہ جب آئے گا تو یہ مہلت اِن کے کچھ بھی کام نہ آئے گی۔ موت اب آئے یا دس سال بعد آئے، وہ جب بھی آئے گی، اُس سے پہلے کی زندگی اپنی تمام قدر و قیمت لازماً کھو دے گی۔

۱۹۸۔ یعنی ایسی پاکیزہ باتیں، ایسی اعلیٰ اور برتر تعلیمات اور ایسا علم حقائق، پھر ایسے فصیح و بلیغ اور دل نشیں اسلوب میں نہ کسی شیطان سے صادر ہو سکتا ہے اور نہ شیاطین کسی منبع خیر سے اِس کو اچک کر لا سکتے ہیں، اِس لیے کہ ملاء اعلیٰ تک اُن کی رسائی کے تمام راستے نزول قرآن کے ساتھ ہی بند کر دیے گئے ہیں۔ قرآن نے دوسری

فَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَتَكُوۡنَ مِنَ الۡمُعَذَّبِيۡنَ ﴿۲۱۳﴾ۚ وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ
الۡاَقۡرَبِيۡنَ ﴿۲۱۴﴾ۙ وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۲۱۵﴾ۚ
فَاِنۡ عَصَوۡكَ فَقُلۡ اِنِّىۡ بَرِىۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۱۶﴾ۚ وَتَوَكَّلۡ عَلَى الۡعَزِيۡزِ

(یہ اب عذاب کی زد میں ہیں، اے پیغمبر)، اِس لیے اللہ کے ساتھ تم کسی دوسرے معبود کو نہ پکارنا کہ تم بھی سزاوار عذاب ہو جاؤ[199]، اور اپنے قریبی خاندان والوں کو بھی اِس سے خبردار کر دو[200]، اور جن اہل ایمان نے تمھاری پیروی کی ہے، اُن کے لیے اپنی شفقت کے بازو جھکائے رکھو[201]۔ ۲۱۳-۲۱۵

لیکن تمھارے خاندان کے یہ لوگ اگر (اس کے باوجود) تمھاری بات نہ مانیں تو اِنھیں صاف صاف بتادو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، میں اُس سے بری ہوں، اور (اپنی دعوت کے اِس مرحلے

جگہ خود جنات کی زبان سے اُن کا یہ اعتراف نقل کیا ہے کہ پہلے ہم آسمان کے ٹھکانوں میں سننے کی کوئی جگہ پا لیتے تھے، مگر ہم نے دیکھا کہ اب جو کچھ سننے کی کوشش کرتا ہے، اپنے لیے گھات میں ایک انگارا پاتا ہے۔ گویا مدعا یہ ہے کہ کلام خود بھی اِس بے ہودہ الزام کی تردید کر رہا ہے اور جن کے حوالے سے لگایا جا رہا ہے، وہ بھی تردید کر رہے ہیں۔

۱۹۹۔ یہ خطاب اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن اِس سے مقصود اُنھی منکرین کو متنبہ کرنا ہے جو پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت کے باوجود اپنے شرک پر اصرار کر رہے تھے۔

۲۰۰۔ اِس لیے کہ تمھاری خیر خواہی کے سب سے زیادہ حق دار بھی وہی ہیں اور اہل عرب کی مذہبی اور سیاسی پیشوائی کا منصب بھی اُنھی کو حاصل ہے۔ لہٰذا متنبہ ہو گئے تو پوری قوم کے لیے خدا کے عذاب سے بچنے کی راہ نکل آئے گی۔

۲۰۱۔ یہ ہدایت اِس لیے فرمائی ہے کہ یہ لوگ زیادہ تر غربا تھے اور قریش کے اکابر ہر وقت اِن کی تحقیر کے درپے رہتے تھے۔ چنانچہ اندیشہ تھا کہ کہیں دل شکستہ ہو کر ایمان کے منافی کوئی کام نہ کر بیٹھیں۔ چنانچہ دونے التفات کے مستحق تھے۔

الرَّحِیۡمِ ﴿۲۱۷﴾ الَّذِیۡ یَرٰىكَ حِیۡنَ تَقُوۡمُ ﴿۲۱۸﴾ وَتَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیۡنَ ﴿۲۱۹﴾ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۲۲۰﴾

میں)[۲۰۲] اُس عزیز و رحیم پر بھروسا رکھو جو تمھیں اُس وقت دیکھتا ہے، جب تم رات میں تہجد کے لیے اٹھتے ہو اور سجدہ کرنے والوں کے درمیان تمھارے آنے اور جانے کو دیکھتا ہے[۲۰۳]۔ بے شک، وہ سمیع و علیم ہے۔۲۱۶-۲۲۰

۲۰۲۔ یعنی جب تمھارے لیے ہجرت اور تمھارے مکذبین کے لیے عذاب کا مرحلہ قریب آرہا ہے۔ یہ مرحلہ چونکہ پیغمبر کے لیے نہایت کٹھن ہوتا ہے، اِس لیے آگے ہدایت فرمائی ہے کہ اِس میں اُس پروردگار پر بھروسا رکھو جو عزیز ہے، لہٰذا عذاب کا فیصلہ کرے گا تو کوئی اُس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ ہوگا اور اپنے بندوں کے لیے رحیم و شفیق بھی ہے، لہٰذا اُنھیں بھی لازماً نوازے گا اور کوئی اُس میں رکاوٹ نہ بن سکے گا۔

۲۰۳۔ یعنی غایت درجہ التفات کے ساتھ دیکھتا ہے۔ یہ اُس آمد و شد کی طرف اشارہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کو دعا و مناجات میں مشغول دیکھنے کے لیے اُن کے درمیان رکھتے تھے۔ اہل ذوق اندازہ کر سکتے ہیں کہ آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی شب خیزی، فکرمندی اور ذکر و عبادت میں مشغولیت کی یہ کس قدر دل نواز انداز میں تحسین ہے۔ آیت میں اِس کے لیے 'تَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیۡنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِس سے 'حِیۡنَ تَقُوۡمُ' کے معنی بھی واضح ہو جاتے ہیں کہ یہ فی الواقع آپ کا نماز تہجد ہی کے لیے اٹھنا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح خود شب کی دعا و مناجات کا اہتمام فرماتے تھے، اُسی طرح اپنے صحابہ کو بھی اِس کی تاکید فرماتے تھے اور وقتاً فوقتاً آپ مسجد میں جا کر یہ روح پرور منظر دیکھتے بھی تھے کہ لوگ دعا و عبادت میں مشغول ہیں۔ اوپر آیت ۲۱۵ میں آپ کو مومنین کے باب میں یہ ہدایت جو فرمائی گئی کہ اُن کو اپنی شفقت کے بازوؤں کے نیچے رکھو، یہ بھی اُسی کا ایک پہلو ہے کہ آپ کی طرح آپ کے ساتھی بھی پوری طرح چوکنے اور بیدار رہیں۔ انجیلوں میں سیدنا مسیح کے بارے میں بھی آتا ہے کہ جب آزمایش کا آخری مرحلہ آیا ہے تو وہ ایک پہاڑی پر جا کر دعا میں مشغول ہو گئے اور اپنے شاگردوں کو بھی ہدایت فرمائی کہ وہ جاگیں اور دعا کریں کہ فتنے میں نہ پڑیں۔ پھر وہ بار بار اپنے شاگردوں کے پاس یہ دیکھنے کے لیے آئے کہ وہ دعا کر رہے ہیں یا نہیں۔ شاگرد سو جاتے تو وہ اُن کو بار بار جگاتے کہ دعا کرو تاکہ فتنے سے محفوظ رہو۔" (تدبر قرآن ۵/ ۵۶۴)

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۲۱﴾ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۲۲﴾
يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴿۲۲۳﴾
وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾

(لوگو، یہ وہ پاکیزہ ہستی ہے جس کے بارے میں تم کہتے ہو کہ اُس پر شیاطین اترتے ہیں)۔ تمھیں بتاؤں کہ شیاطین کس پر اترتے ہیں؟ وہ ہر لپاٹیے بدکار پر اترتے ہیں۔ وہ (اُن کی طرف) کان لگاتے ہیں (کہ غیب سے کچھ سن رہے ہیں)[۲۰۴]، مگر اُن میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں[۲۰۵]۔ ۲۲۱-۲۲۳
(اور کہتے ہو کہ وہ بھی گویا ایک شاعر ہے[۲۰۶]، جب کہ) شاعروں کے پیچھے تو بہکے ہوئے لوگ

۲۰۴۔ یہ اُن کاہنوں کی تصویر ہے جو اُس زمانے کے عرب میں اکثر دیکھے جاتے تھے۔ ہمارے ہاں کے متصوفین اور عاملوں کی تصویر بھی اِس سے مختلف نہیں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اِن کی پہلی صفت یہ بتائی ہے کہ یہ 'اَفَّاك' یعنی بالکل لاغی، دروغ باف اور لپاٹیے ہوتے ہیں۔ یہ سادہ لوحوں کو بے وقوف بنانے کے لیے طرح طرح کے جھوٹ گھڑتے ہیں اور پھر اِس دعوے کے ساتھ اُن کو پیش کرتے ہیں کہ یہ باتیں اِن پر غیب سے القا ہوئی ہیں۔ اِن کی دوسری صفت 'اَثِيْم' بیان ہوئی ہے، یعنی اخلاقی اعتبار سے یہ ہر قسم کے گناہوں میں آلودہ ہیں۔ آخر میں اِن کے اُس بھگل کی تصویر پیش کی گئی ہے جو عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے یہ لوگ اختیار کرتے تھے۔ اِن لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ احمق لوگ جب کسی معاملے میں غیب کی باتیں معلوم کرنے کے لیے اِن سے رجوع کرتے تو یہ لوگ کچھ عملیات سفلیہ کے ساتھ مراقبہ کرتے اور پھر ایک مقفّٰی کلام کی صورت میں (جو اکثر بالکل بے معنی یا ذو معانی ہوتا)، اپنا الہام پیش کرتے کہ یہ اِن پر غیب سے فلاں جن نے القا کیا ہے۔ اِن کے اِس مراقبے کو یہاں 'القاے سمع' سے تعبیر فرمایا ہے، اِس لیے کہ وہ مراقبے میں اِس طرح بیٹھتے گویا ہاتف غیب سے کوئی بات سننے کے لیے کان لگائے ہوئے ہیں۔“ (تدبر قرآن ۵/ ۵۶۵)

۲۰۵۔ یعنی بعض توفی الواقع اپنے عملیات سفلیہ کے ذریعے سے شیاطین جن کے ساتھ کچھ رابطہ پیدا کر لیتے اور اُن سے الہام پاتے ہیں، لیکن اکثر اپنے اِس پیشۂ کہانت میں بھی سچے نہیں ہوتے، محض عوام فریبی کے لیے اپنے آپ کو کاہن بنا کر پیش کرتے اور غیب دانی کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔

۲۰۶۔ یہ بات وہ اِس معنی میں کہتے تھے کہ جو بلاغت و جزالت اِن کے کلام میں دیکھ رہے ہو، وہ اُسی طرح

وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿٢٢٦﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

چلا کرتے ہیں[۲۰۷]۔ کیا دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں[۲۰۸] اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو

کی بلاغت و جزالت ہے جو ہمارے شاعروں کے کلام میں بھی ہوتی ہے، خاص طور پر اُن بڑے شاعروں کے کلام میں جن کے ساتھ جنات ہوتے ہیں جو اُنھیں شعر الہام کرتے ہیں۔ اِسے آں سوے افلاک کی کوئی چیز قرار دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۰۷۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کے تقابل میں فرمایا ہے کہ شاعروں کے پیرو تو سیرت و کردار کے لحاظ سے ایسے مہ و آفتاب اور سجدوں میں راتیں بسر کرنے والے نہیں ہوتے۔ تم شاعروں کو بھی جانتے ہو اور اُن کے پیرووں کو بھی۔ اُن میں سے تو ہر ایک دوسرے سے بڑھ کر اوباش، گم راہ، دین و اخلاق کی بندشوں سے آزاد اور جذبات و خواہشات کا غلام ہوتا ہے۔ کیا اندھے ہو گئے ہو کہ اِن دونوں گروہوں کا یہ کھلا کھلا فرق و امتیاز بھی دیکھ نہیں پاتے ہو؟

۲۰۸۔ یہ قرآن کے تقابل میں فرمایا ہے کہ اُسے شاعری کہتے ہو؟ کہاں اُس کی ہم رنگی و ہم آہنگی کہ ہر آیت اپنے معین ہدف اور طے شدہ مقصد کے تحت صادر ہوتی ہے، اُس میں کسی جگہ کوئی تضاد و تخالف نہیں ہوتا، اُس کے مضامین باہم مربوط، نہایت بچے تلے، دوٹوک، سراسر دانش و حکمت اور ہر جگہ اپنے اندر راستی، حق اور خیر و صلاح کی دعوت لیے ہوئے ہوتے ہیں، اور کہاں تمھارے شاعر کہ بے لگام گھوڑے کی طرح ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ استاذ امام کے الفاظ میں:

> ”...جو وارده دل پر گزر گیا، اگر اُس کو ادا کرنے کے لیے اُن کو کوئی اچھوتا اسلوب ہاتھ آ گیا تو اُس کو شعر کے قالب میں ڈھال دیں گے۔ اِس سے بحث نہیں کہ وہ رحمانی ہے یا شیطانی، روحانی ہے یا نفسانی، اُس سے خیر کی تحریک ہو گی یا شر کی۔ اُن کے اشعار پڑھیے تو ایک شعر سے معلوم ہو گا کہ ولی ہیں، دوسرے شعر سے معلوم ہو گا کہ شیطان ہیں۔ ایک ہی سانس میں وہ نیکی اور بدی، دونوں کی باتیں بے تکلف کہتے ہیں اور چونکہ اچھوتے اور موثر اسلوب میں کہتے ہیں، اِس وجہ سے پڑھنے والے دونوں سے متاثر تو ہوتے ہیں، لیکن نفس کو زیادہ مرغوب چونکہ بدی کی باتیں ہیں، اِس وجہ سے اُس کے نقوش تو دلوں پر قائم رہ جاتے ہیں، نیکی کا اثر غائب ہو جاتا ہے اور اِس طرح اگر اُن کے کلام میں کچھ افادیت ہوتی بھی ہے تو وہ اُن کے تضاد فکر میں غائب ہو جاتی ہے ـــــ جھاڑ جھنکاڑ کے جنگل میں اگر کچھ صالح پودے بھی لگا دیے جائیں تو وہ مثمر نہیں ہوتے۔“

(تدبر قرآن ۵/ ۵۶۷)

وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۷﴾

کرتے نہیں ہیں[۲۰۹]؟ اِس سے وہی مستثنیٰ ہیں جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے اور اللہ کو بہت یاد کیا اور اُسی وقت بدلہ لیا، جب اُن پر ظلم کیا گیا[۲۱۰] ـــــ اور یہ ظلم کرنے والے، اِنھیں جلد معلوم ہو جائے گا کہ اِن کا ٹھکانا کیا ہوتا ہے۔ ۲۲۴-۲۲۷

۲۰۹۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تقابل میں فرمایا ہے کہ کہاں وہ قدسی صفات ہستی جس کا کلام اُس کی شخصیت میں مجسم ہو گیا ہے اور کہاں یہ گفتار کے غازی جو تمھارے شاعر ہیں ـــــ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ اِنھیں شعروں میں دیکھیے تو رستم و سہراب بھی ہوں گے اور قیس و فرہاد بھی، لیکن اِن کی یہ رزم و بزم، سب خیالی ہوتی ہے۔ چنانچہ مکارم اخلاق کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے ہوں گے، مگر اپنے آپ کو اُن کی ہوا بھی نہیں لگنے دیں گے۔ زہد و تصوف کے لطائف و حقائق بیان کریں گے، مگر حال وہی ہو گا کہ ـــــ پر طبیعت ادھر نہیں آتی۔

۲۱۰۔ یہ اُن شاعروں کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے۔ فرمایا کہ جس کو شاعر سمجھ رہے ہو، یہ اُس کی دعوت پر ایمان کا اثر ہے کہ وہی گفتار کے غازی اب صرف گفتار کے غازی نہیں رہے، بلکہ تقویٰ اور عمل صالح کی دولت سے بھی بہرہ مند ہو گئے ہیں، عشق و ہوس اور مفاخر و مطاعن کے بجاے اب اُن کی شاعری میں زیادہ سے زیادہ اللہ کا ذکر ہوتا ہے اور کسی کے بارے میں کچھ کہتے بھی ہیں تو حق کی مدافعت میں اور اُسی وقت کہتے ہیں، جب اُنھیں یا اُن کے ساتھیوں کو ظلم و عدوان کا ہدف بنایا جاتا ہے۔

یہ استثنا اِس لیے ضروری تھا کہ شاعری بجاے خود کوئی قابل مذمت چیز نہیں ہے، بلکہ ایک عطیۂ خداوندی ہے جسے اگر صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے تو روح کے اہتزاز اور قلب و نظر کی تطہیر کا باعث بن جاتی ہے۔

کوالالمپور

۲۱/ اکتوبر ۲۰۱۳ء

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

ترجمہ و تحقیق: ڈاکٹر محمد عامر گزدر

عذاب قبر

(۳)

—— ۱۳ ——

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَيْضًا، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ:[1] «إِنَّ الْمَيِّتَ تَحْضُرُهُ الْمَلَائِكَةُ، فَإِذَا كَانَ الرَّجُلُ الصَّالِحُ، قَالُوا: اخْرُجِي أَيَّتُهَا النَّفْسُ الطَّيِّبَةُ، كَانَتْ فِي الْجَسَدِ الطَّيِّبِ، وَاخْرُجِي حَمِيدَةً، وَأَبْشِرِي بِرَوْحٍ وَرَيْحَانٍ، وَرَبٍّ غَيْرِ غَضْبَانَ. فَلَا يَزَالُ يُقَالُ لَهَا ذٰلِكَ حَتَّى تَخْرُجَ، ثُمَّ يُعْرَجُ بِهَا إِلَى السَّمَاءِ، فَيُسْتَفْتَحُ لَهُ، فَيُقَالُ: مَنْ هٰذَا؟ فَيُقَالُ: فُلَانٌ، فَيُقَالُ: مَرْحَبًا بِالنَّفْسِ الطَّيِّبَةِ كَانَتْ فِي الْجَسَدِ الطَّيِّبِ، ادْخُلِي حَمِيدَةً، وَأَبْشِرِي بِرَوْحٍ وَرَيْحَانٍ وَرَبٍّ غَيْرِ غَضْبَانَ، فَلَا يَزَالُ يُقَالُ لَهَا ذٰلِكَ حَتَّى يُنْتَهَى بِهَا إِلَى السَّمَاءِ الَّتِي فِيهَا اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ. فَإِذَا كَانَ الرَّجُلُ السَّوْءُ، قَالُوا: اخْرُجِي أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْخَبِيثَةُ، كَانَتْ فِي

الْجَسَدِ الْخَبِيثِ، اخْرُجِي مِنْهُ ذَمِيمَةً، وَأَبْشِرِي بِحَمِيمٍ وَغَسَّاقٍ، ﴿وَآخَرُ مِنْ شَكْلِهِ أَزْوَاجٌ﴾. فَمَا يَزَالُ يُقَالُ لَهَا ذٰلِكَ حَتَّى تَخْرُجَ ثُمَّ يُعْرَجُ بِهَا إِلَى السَّمَاءِ فَيُسْتَفْتَحُ لَهَا، فَيُقَالُ: مَنْ هٰذَا؟ فَيُقَالُ: فُلَانٌ، فَيُقَالُ: لَا مَرْحَبًا بِالنَّفْسِ الْخَبِيثَةِ، كَانَتْ فِي الْجَسَدِ الْخَبِيثِ، ارْجِعِي ذَمِيمَةً، فَإِنَّهُ لَا يُفْتَحُ لَكِ أَبْوَابُ السَّمَاءِ. فَتُرْسَلُ مِنَ السَّمَاءِ، ثُمَّ تَصِيرُ إِلَى الْقَبْرِ[2]. فَيُجْلَسُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ، فَيُقَالُ لَهُ ... » وَيَرُدُّ مِثْلَ مَا فِي حَدِيثِ عَائِشَةَ، سَوَاءً، «وَيَجْلِسُ الرَّجُلُ السُّوءُ، فَيُقَالُ لَهُ ... » وَيَرُدُّ مِثْلَ مَا فِي حَدِيثِ عَائِشَةَ سَوَاءً.

اِنھی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: موت کے وقت آدمی کے پاس فرشتے آتے ہیں۔ اگر وہ نیک ہو تو اُس سے کہتے ہیں: اے پاکیزہ نفس، جو پاکیزہ جسم میں رہا، قابل ستایش حال میں باہر آجا اور راحت و سرور کی اور اُس رب (سے ملاقات) کی خوش خبری قبول کر، جو تجھ سے ناراض نہیں ہے۔ پھر اُس سے یہ بات بار بار کہی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ باہر آجاتا ہے۔ پھر اُس کو آسمان پر لے جایا جاتا ہے، اُس کے لیے دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے، پھر آواز آتی ہے، یہ کون ہے؟ جواب دیا جاتا ہے: فلاں۔ پھر (آسمان والوں کی طرف سے) کہا جاتا ہے: اِس پاکیزہ نفس کو، جو پاکیزہ جسم میں رہا، خوش آمدید۔ قابل تعریف ہو کر داخل ہو جاؤ اور راحت و سرور کی اور اُس رب سے ملاقات کی خوش خبری قبول کرو، جو تم سے ناراض نہیں ہے۔ یہی بات اُس سے ہر آسمان میں کہی جاتی ہے، یہاں تک کہ اُس کو اُس آسمان پر لے جایا جاتا ہے، جہاں خود اللہ تعالیٰ کی ہستی موجود ہے[1]۔ (فرمایا): اور آدمی اگر گناہ گار ہو تو فرشتے کہتے ہیں کہ اے ناپاک نفس، جو ناپاک جسم میں رہا، قابل مذمت ہو کر جسم سے نکل۔ کھولتے ہوئے پانی اور کانٹے دار کھانے کی خوش خبری قبول کر اور اِسی طرح دوسرے ہر قسم کے عذاب کی بھی۔ اِس نفس سے یہ بات بار بار

کہی جاتی ہے، یہاں تک کہ روح نکل جاتی ہے۔ پھر اِس کو آسمانوں کی طرف لے جایا جاتا ہے، اِس کے لیے (آسمان کا) دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے۔ پوچھا جاتا ہے: کون؟ بتایا جاتا ہے کہ فلاں ہے۔ پھر وہاں سے جواب آتا ہے کہ اِس ناپاک نفس کے لیے، جو ناپاک جسم میں رہا، کوئی خوش آمدید نہیں ہے۔ اِسی حال میں قابل مذمت واپس چلے جاؤ، اِس لیے کہ تیرے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔ چنانچہ اُس کو آسمان سے واپس بھیج دیا جاتا ہے، جس کے بعد وہ قبر میں چلا جاتا ہے۔[2] پھر نیک و بد، دونوں قسم کے لوگوں کو قبر میں بٹھایا جاتا اور اُن کے ساتھ قبر میں سوال و جواب کا جو معاملہ ہوتا ہے، وہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اِس روایت میں بالکل اُسی طرح نقل ہوا ہے، جس طرح سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں مذکور ہے۔[3]

۱۔ یعنی جہاں عرش الٰہی ہے۔ یہاں یہ ملحوظ رہے کہ اپنے اوپر جس آسمان کو ہم دیکھتے ہیں، یہ اُن سات میں سے ایک ہے، جن کا ذکر قرآن میں ہوا ہے اور یہی ہمارے لیے وہ پوری کائنات ہے، جس سے ہم واقف ہیں۔ باقی چھ ہماری حد علم سے ماوراہیں۔

۲۔ یہاں بھی 'قبر' کا لفظ اُسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے، جس کی وضاحت ہم پیچھے کرتے آرہے ہیں کہ اِس سے مراد اِسی زمین میں وہ جگہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اُن سب نفوس کو رکھنے کا اہتمام کیا ہے، جنھیں ملائکہ موت کے وقت انسان کے اِس مادی جسم سے الگ کر کے اپنی تحویل میں لے لیتے ہیں۔ اِس سے آگے کا جملہ بتا رہا ہے کہ بدوں کی طرح نیک لوگ بھی ملاء اعلیٰ میں حاضری کے بعد اِسی طرح قبروں میں لوٹا دیے جاتے ہیں۔ یہ حاضری بھی، ظاہر ہے کہ انسان کی اصل شخصیت ہی کی ہوتی ہے۔

۳۔ یہ حدیث، رقم ۵ کا حوالہ ہے۔ جو سوال و جواب وہاں نقل ہوئے ہیں، وہی یہاں بھی منقول ہیں۔ چنانچہ صاف واضح ہے کہ یہ بھی اُنھی لوگوں کا ذکر ہے، جن کے احوال پیچھے سیدہ کی روایت میں گزر چکے ہیں۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن مسند احمد، رقم ۲۵۰۹۰ سے لیا گیا ہے۔ تعبیر کے معمولی تفاوت کے ساتھ اِس کے

باقی طرق جن مراجع میں نقل ہوئے ہیں، وہ یہ ہیں: مسند احمد، رقم ۸۷۶۹۔ صحیح مسلم، رقم ۲۸۷۲۔ سنن ابن ماجہ، رقم ۴۲۶۲۔ السنۃ، عبد اللہ بن احمد، رقم ۱۴۴۹۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۱۱۳۷۸۔ التوحید، ابن خزیمہ، رقم ۱۷۶۔ الشریعۃ، آجری، رقم ۹۲۳۔ الایمان، ابن مندہ، رقم ۱۰۶۸۔ اثبات عذاب القبر، بیہقی، رقم ۳۵۔

۲۔ بعض طرق، مثلاً السنۃ، عبد اللہ بن احمد، رقم ۱۴۴۹ میں یہاں 'تَصِيرُ إِلَى الْقَبْرِ' کے بجائے 'يَصِيرَانِ إِلَى الْقَبْرِ' کے الفاظ آئے ہیں، جن کا مفہوم یہ ہے کہ نیک و بد، دونوں طرح کے نفوس قبروں میں چلے جاتے ہیں۔

— ۱۴ —

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَيْضًا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ:[1] «إِذَا حُضِرَ الْمُؤْمِنُ أَتَتْهُ مَلَائِكَةُ الرَّحْمَةِ بِحَرِيرَةٍ بَيْضَاءَ فَيَقُولُونَ: اخْرُجِي رَاضِيَةً مَرْضِيًّا عَنْكِ إِلَى رَوْحِ اللهِ، وَرَيْحَانٍ، وَرَبٍّ غَيْرِ غَضْبَانَ، فَتَخْرُجُ كَأَطْيَبِ رِيحِ الْمِسْكِ، حَتَّى أَنَّهُ لَيُنَاوِلُهُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا [يَشُمُّونَهُ[2]]، حَتَّى يَأْتُونَ بِهِ بَابَ السَّمَاءِ فَيَقُولُونَ: مَا أَطْيَبَ هٰذِهِ الرِّيحَ الَّتِي جَاءَتْكُمْ مِنَ الْأَرْضِ، فَيَأْتُونَ بِهِ أَرْوَاحَ الْمُؤْمِنِينَ فَلَهُمْ أَشَدُّ فَرَحًا بِهِ مِنْ أَحَدِكُمْ بِغَائِبِهِ يَقْدَمُ عَلَيْهِ، فَيَسْأَلُونَهُ: مَاذَا فَعَلَ فُلَانٌ؟ مَاذَا فَعَلَ فُلَانٌ؟ فَيَقُولُونَ: دَعُوهُ فَإِنَّهُ كَانَ فِي غَمِّ الدُّنْيَا، فَإِذَا قَالَ: أَمَا أَتَاكُمْ؟ قَالُوا: ذُهِبَ بِهِ إِلَى أُمِّهِ الْهَاوِيَةِ، وَإِنَّ الْكَافِرَ إِذَا احْتُضِرَ أَتَتْهُ مَلَائِكَةُ الْعَذَابِ بِمِسْحٍ فَيَقُولُونَ: اخْرُجِي سَاخِطَةً مَسْخُوطًا عَلَيْكِ إِلَى عَذَابِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ، فَتَخْرُجُ كَأَنْتَنِ رِيحِ جِيفَةٍ، حَتَّى يَأْتُونَ بِهِ بَابَ الْأَرْضِ، فَيَقُولُونَ: مَا أَنْتَنَ هٰذِهِ الرِّيحَ حَتَّى يَأْتُونَ بِهِ أَرْوَاحَ الْكُفَّارِ».

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب بندۂ مومن کی وفات کا وقت قریب ہوتا ہے تو رحمت کے فرشتے اُس کے پاس ایک سفید ریشمی کپڑا لے کر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (اے مطمئن نفس،) اللہ کی عطا کردہ راحت اور سرور کی طرف اور اپنے پروردگار کی طرف، جو تجھ سے خوش ہے، باہر نکل آ، اِس حال میں کہ تو اُس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی۔ چنانچہ وہ روح مشک کی عمدہ ترین خوشبو کی طرح جسم سے نکلتی ہے اور فرشتے اُس کی یہ خوشبو سونگھتے، اُس کو ایک دوسرے کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے آسمان کے دروازے پر لے جا کر کہتے ہیں: (دیکھیے)، یہ کس قدر عمدہ خوشبو ہے جو زمین سے تمھارے پاس آئی ہے۔ پھر اُس کو مومنین کی روحوں کے پاس لاتے ہیں' جو اُس کی آمد سے ایسی مسرت محسوس کرتی ہیں جو تمھیں اپنے کسی بچھڑے ہوئے شخص کی ملاقات سے بھی نہیں ہوتی۔ پھر وہ ارواح اُس سے دنیا کے حالات پوچھتی ہیں کہ فلاں آدمی نے کیا کیا اور فلاں نے کیا کیا؟ پھر وہ کہتی ہیں کہ ابھی اِسے آرام کرنے دو، اِس لیے کہ یہ دنیا کے غموں میں تھا۔ جب یہ روح اُن سے پوچھتی ہے کہ فلاں شخص مرنے کے بعد کیا تمھارے پاس نہیں آیا، تو اِس پر وہ روحیں کہتی ہیں: اُس کو تو اُس کی گہری کھائی کے ٹھکانے، (یعنی جہنم) میں لے جایا گیا ہے۔ (فرمایا): اور جب کافر کی موت کا وقت آتا ہے تو عذاب کے فرشتے ایک ٹاٹ کا کپڑا لے کر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (اے نفس)، تو اللہ کے عذاب کی طرف باہر نکل آ، اِس حال میں کہ تو بھی ناراض اور وہ بھی تجھ پر ناراض۔ چنانچہ وہ روح سڑے ہوئے مردار کی بدبو کی طرح (جسم سے) باہر نکلتی ہے اور فرشتے اُس کو زمین کے دروازے[2] پر لا کر کہتے ہیں: یہ کیسی بری بو ہے، پھر اُس کو کفار کی روحوں میں لے جاتے ہیں۔

۱۔ یہ اُس وقت ہوتا ہے، جب روحیں زمین پر اپنے مستقر میں واپس آجاتی ہیں۔ راوی نے یہاں بعض مراحل حذف کر دیے ہیں۔ چنانچہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ آسمان ہی پر پیش آجاتا ہے۔ آگے براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی مفصل روایت سے ہماری یہ بات مزید واضح ہو جائے گی۔

۲۔ یعنی جہاں سے زمین کا مدار شروع ہوتا ہے۔ زمین اور آسمان کے دروازوں سے اِن روایتوں میں غالباً یہی مراد ہے۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن اصلاً السنن الصغریٰ، نسائی، رقم ۱۸۳۳ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے متابعات اِن مصادر میں دیکھ لیے جا سکتے ہیں: مسند طیالسی، رقم ۲۵۱۱۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۱۹۷۲، ۱۱۹۲۴، ۱۱۹۲۶، ۱۱۹۲۷۔ صحیح ابن حبان، رقم ۳۰۱۳، ۳۰۱۴۔ المعجم الاوسط، طبرانی، رقم ۴۲۷۔

۲۔ صحیح ابن حبان، رقم ۳۰۱۴۔

— ۱۵ —

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ، قَالَ[۱]: ﴿يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ﴾ [ابراہیم ۱۴: ۲۷] قَالَ: «نَزَلَتْ فِي عَذَابِ الْقَبْرِ، فَيُقَالُ لَهُ: مَنْ رَبُّكَ؟ فَيَقُولُ: رَبِّيَ اللّٰهُ، وَنَبِيِّي مُحَمَّدٌ، فَذٰلِكَ قَوْلُهُ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ﴾» [ابراہیم ۱۴: ۲۷].

براء بن عازب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ’﴿يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ﴾‘، ”ایمان والوں کو اللہ محکم بات سے ثبات عطا فرمائے گا“ (ابراہیم ۱۴: ۲۷) قبر کے عذاب کے بارے میں نازل ہوا ہے۔ اِس لیے کہ مرنے والے سے (قبر میں) کہا جاتا ہے کہ تیرا رب کون ہے؟ تو وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور میرے نبی محمد ہیں۔ یہی بات ہے جو اللہ تعالیٰ کے فرمان: ’﴿يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ﴾‘، ”ایمان والوں کو اللہ محکم بات سے دنیا اور آخرت، (دونوں) کی زندگی میں ثبات عطا فرمائے گا“ (ابراہیم ۱۴: ۲۷) میں بیان ہوئی ہے۔[۱]

۱۔ قرآن میں ’فِی الْاٰخِرَۃِ‘ کے الفاظ ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات اگر فرمائی ہے تو غالباً اِس پہلو سے فرمائی ہے کہ مرنے والوں کے لیے برزخ گویا آخرت ہی کی تمہید ہے۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن صحیح مسلم، رقم ۲۸۷۱ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے متابعات جن مراجع میں نقل ہوئے ہیں، وہ یہ ہیں: مسند طیالسی، رقم ۷۸۱۔ مسند احمد، رقم ۱۸۴۸۲، ۱۸۵۷۵۔ صحیح بخاری، رقم ۱۳۶۹، ۴۶۹۹۔ سنن ابن ماجہ، رقم ۴۲۶۹۔ سنن ابی داؤد، رقم ۴۷۵۰۔ سنن ترمذی، رقم ۳۱۲۰۔ السنۃ، عبد اللہ بن احمد، رقم ۱۴۳۷، ۱۴۵۱۔ السنن الصغریٰ، نسائی، رقم ۲۰۵۷۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۲۱۹۵، ۱۱۲۰۰۔ مسند رویانی، رقم ۳۹۴۔ صحیح ابن حبان، رقم ۲۰۶، ۶۳۲۴۔ الایمان، ابن مندہ، رقم ۱۶۶، ۱۰۶۲۔ شرح اصول اعتقاد اہل السنۃ والجماعۃ، لالکائی، رقم ۲۱۲۱، ۲۱۲۲۔ اثبات عذاب القبر، بیہقی، رقم ۱، ۲، ۴، ۸۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

— ۱۶ —

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ أَيْضًا، قَالَ[۱]: خَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي جَنَازَةِ رَجُلٍ مِنَ الْأَنْصَارِ، فَانْتَهَيْنَا إِلَى الْقَبْرِ، وَلَمَّا يُلْحَدْ [لَهُ[۲]]، فَجَلَسَ رَسُولُ اللهِ ﷺ، وَجَلَسْنَا حَوْلَهُ، كَأَنَّ عَلَى رُءُوسِنَا الطَّيْرَ، [فَجَعَلَ يَرْفَعُ بَصَرَهُ وَيَنْظُرُ إِلَى السَّمَاءِ وَيَخْفِضُ بَصَرَهُ وَيَنْظُرُ إِلَى الْأَرْضِ،[۳]] وَفِي يَدِهِ عُودٌ يَنْكُتُ فِي الْأَرْضِ، فَرَفَعَ رَأْسَهُ، فَقَالَ: «اسْتَعِيذُوا بِاللهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ مَرَّتَيْنِ، أَوْ ثَلَاثًا»، ثُمَّ قَالَ: «إِنَّ الْعَبْدَ الْمُؤْمِنَ إِذَا كَانَ فِي انْقِطَاعٍ مِنَ الدُّنْيَا وَإِقْبَالٍ مِنَ الْآخِرَةِ، نَزَلَ إِلَيْهِ مَلَائِكَةٌ مِنَ السَّمَاءِ بِيضُ الْوُجُوهِ، كَأَنَّ وُجُوهَهُمُ الشَّمْسُ، مَعَهُمْ كَفَنٌ مِنْ أَكْفَانِ الْجَنَّةِ، وَحَنُوطٌ مِنْ حَنُوطِ الْجَنَّةِ، حَتَّى يَجْلِسُوا مِنْهُ مَدَّ الْبَصَرِ،

ثُمَّ يَجِيءُ مَلَكُ الْمَوْتِ عَلَيْهِ السَّلَامُ، حَتَّى يَجْلِسَ عِنْدَ رَأْسِهِ، فَيَقُولُ: أَيَّتُهَا النَّفْسُ [الْمُطْمَئِنَّةُ[٤]] الطَّيِّبَةُ، اخْرُجِي إِلَى مَغْفِرَةٍ مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ». قَالَ: «فَتَخْرُجُ تَسِيلُ كَمَا تَسِيلُ الْقَطْرَةُ مِنْ فِي السِّقَاءِ، فَيَأْخُذُهَا، فَإِذَا أَخَذَهَا لَمْ يَدَعُوهَا فِي يَدِهِ طَرْفَةَ عَيْنٍ حَتَّى يَأْخُذُوهَا، فَيَجْعَلُوهَا فِي ذٰلِكَ الْكَفَنِ، وَفِي ذٰلِكَ الْحَنُوطِ، وَيَخْرُجُ مِنْهَا كَأَطْيَبِ نَفْحَةِ مِسْكٍ وُجِدَتْ عَلَى وَجْهِ الْأَرْضِ» قَالَ: «فَيَصْعَدُونَ بِهَا، فَلَا يَمُرُّونَ، يَعْنِي بِهَا، عَلَى مَلَإٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ، إِلَّا قَالُوا: مَا هٰذَا الرُّوحُ الطَّيِّبُ؟ فَيَقُولُونَ: فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ، بِأَحْسَنِ أَسْمَائِهِ الَّتِي كَانُوا يُسَمُّونَهُ بِهَا فِي الدُّنْيَا، حَتَّى يَنْتَهُوا بِهَا إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا، فَيَسْتَفْتِحُونَ لَهُ، فَيُفْتَحُ لَهُمْ فَيُشَيِّعُهُ مِنْ كُلِّ سَمَاءٍ مُقَرَّبُوهَا إِلَى السَّمَاءِ الَّتِي تَلِيهَا، حَتَّى يُنْتَهَى بِهِ إِلَى السَّمَاءِ السَّابِعَةِ، فَيَقُولُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ: اكْتُبُوا كِتَابَ عَبْدِي فِي عِلِّيِّينَ، وَأَعِيدُوهُ إِلَى الْأَرْضِ، فَإِنِّي مِنْهَا خَلَقْتُهُمْ، وَفِيهَا أُعِيدُهُمْ، وَمِنْهَا أُخْرِجُهُمْ تَارَةً أُخْرَى». قَالَ: «[فَيُرَدُّ إِلَى الْأَرْضِ،[٥]] فَتُعَادُ رُوحُهُ فِي جَسَدِهِ، فَيَأْتِيهِ مَلَكَانِ، فَيُجْلِسَانِهِ، فَيَقُولَانِ لَهُ: مَنْ رَبُّكَ؟ فَيَقُولُ: رَبِّيَ اللّٰهُ، فَيَقُولَانِ لَهُ: مَا دِينُكَ؟ فَيَقُولُ: دِينِيَ الْإِسلَامُ، فَيَقُولَانِ لَهُ: مَا هٰذَا الرَّجُلُ الَّذِي بُعِثَ فِيكُمْ؟ فَيَقُولُ: هُوَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ، [فَيَقُولَانِ: وَمَا يُدْرِيكَ؟ فَيَقُولُ: جَاءَنَا بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّنَا فَآمَنْتُ بِهِ وَصَدَّقْتُهُ،[٦]] فَيَقُولَانِ: لَهُ: وَمَا عِلْمُكَ؟ فَيَقُولُ: قَرَأْتُ كِتَابَ اللّٰهِ، فَآمَنْتُ بِهِ وَصَدَّقْتُ،» [قَالَ: «وَذٰلِكَ قَوْلُهُ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

عَزَّ وَجَلَّ: ﴿يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِی الْاٰخِرَةِ﴾» [ابراہیم ۱۴: ۲۷]» قَالَ[٧]]: «فَيُنَادِي مُنَادٍ فِي السَّمَاءِ: أَنْ صَدَقَ عَبْدِي، فَأَفْرِشُوهُ مِنَ الْجَنَّةِ، وَأَلْبِسُوهُ مِنَ الْجَنَّةِ، وَافْتَحُوا لَهُ بَابًا إِلَى الْجَنَّةِ». قَالَ: «فَيَأْتِيهِ مِنْ رَوْحِهَا، وَطِيبِهَا، وَيُفْسَحُ لَهُ فِي قَبْرِهِ مَدَّ بَصَرِهِ». قَالَ: «وَيَأْتِيهِ رَجُلٌ حَسَنُ الْوَجْهِ، حَسَنُ الثِّيَابِ، طَيِّبُ الرِّيحِ، فَيَقُولُ [لَهُ[٨]]: أَبْشِرْ بِالَّذِي يَسُرُّكَ، هٰذَا يَوْمُكَ الَّذِي كُنْتَ تُوعَدُ، فَيَقُولُ لَهُ: مَنْ أَنْتَ [يَرْحَمُكَ اللّٰهُ[٩]]؟ فَوَجْهُكَ الْوَجْهُ يَجِيءُ بِالْخَيْرِ، فَيَقُولُ: أَنَا عَمَلُكَ الصَّالِحُ، [فَوَاللّٰهِ مَا عَلِمْتُكَ إِلَّا كُنْتَ سَرِيعًا فِي طَاعَةِ اللّٰهِ بَطِيئًا عَنْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ فَجَزَاكَ اللّٰهُ خَيْرًا[١٠]] فَيَقُولُ: رَبِّ أَقِمِ السَّاعَةَ [ثَلَاثًا،[١١]] حَتَّى أَرْجِعَ إِلَى أَهْلِي، وَمَالِي». قَالَ: «وَإِنَّ الْعَبْدَ الْكَافِرَ[١٢] إِذَا كَانَ فِي انْقِطَاعٍ مِنَ الدُّنْيَا وَإِقْبَالٍ مِنَ الْآخِرَةِ، نَزَلَ إِلَيْهِ مِنَ السَّمَاءِ مَلَائِكَةٌ سُودُ الْوُجُوهِ، مَعَهُمُ الْمُسُوحُ، فَيَجْلِسُونَ مِنْهُ مَدَّ الْبَصَرِ، ثُمَّ يَجِيءُ مَلَكُ الْمَوْتِ، حَتَّى يَجْلِسَ عِنْدَ رَأْسِهِ، فَيَقُولُ: أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْخَبِيثَةُ، اخْرُجِي إِلَى سَخَطٍ مِنَ اللّٰهِ وَغَضَبٍ». قَالَ: «فَتُفَرَّقُ فِي جَسَدِهِ، فَيَنْتَزِعُهَا كَمَا يُنْتَزَعُ السَّفُّودُ مِنَ الصُّوفِ الْمَبْلُولِ، فَيَأْخُذُهَا، فَإِذَا أَخَذَهَا لَمْ يَدَعُوهَا فِي يَدِهِ طَرْفَةَ عَيْنٍ حَتَّى يَجْعَلُوهَا فِي تِلْكَ الْمُسُوحِ، وَيَخْرُجُ مِنْهَا كَأَنْتَنِ رِيحِ جِيفَةٍ وُجِدَتْ عَلَى وَجْهِ الْأَرْضِ، فَيَصْعَدُونَ بِهَا، فَلَا يَمُرُّونَ بِهَا عَلَى مَلَاءٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ، إِلَّا قَالُوا: مَا هٰذَا الرُّوحُ الْخَبِيثُ؟ فَيَقُولُونَ: فُلَانُ بْنُ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

فُلَانٍ بِأَقْبَحِ أَسْمَائِهِ الَّتِي كَانَ يُسَمَّى بِهَا فِي الدُّنْيَا، حَتَّى يُنْتَهَى بِهِ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا، فَيُسْتَفْتَحُ لَهُ، فَلَا يُفْتَحُ لَهُ»، ثُمَّ قَرَأَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: ﴿لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ [الاعراف ۷:۴۰] فَيَقُولُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ: «اكْتُبُوا كِتَابَهُ فِي سِجِّينٍ فِي الْأَرْضِ السُّفْلَى، [وَأَعِيدُوهُ إِلَى الْأَرْضِ، فَإِنِّي مِنْهَا خَلَقْتُهُمْ، وَفِيهَا أُعِيدُهُمْ، وَمِنْهَا أُخْرِجُهُمْ تَارَةً أُخْرَى» قَالَ[13]] «فَتُطْرَحُ رُوحُهُ طَرْحًا»[14]. ثُمَّ قَرَأَ [رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ[15]]: ﴿وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ﴾ [الحج ۲۲:۳۱] «[وَيُعَادُ إِلَى الْأَرْضِ،[16]] فَتُعَادُ رُوحُهُ فِي جَسَدِهِ، وَيَأْتِيهِ مَلَكَانِ [شَدِيدَا الِانْتِهَارِ فَيَنْتَهِرَانِهِ[17]] فَيُجْلِسَانِهِ، فَيَقُولَانِ لَهُ: مَنْ رَبُّكَ؟ فَيَقُولُ: هَاهْ هَاهْ لَا أَدْرِي، فَيَقُولَانِ لَهُ: مَا دِينُكَ؟ فَيَقُولُ: هَاهْ هَاهْ لَا أَدْرِي، فَيَقُولَانِ لَهُ: مَا هٰذَا الرَّجُلُ الَّذِي بُعِثَ فِيكُمْ؟ فَيَقُولُ: هَاهْ هَاهْ لَا أَدْرِي، فَيُنَادِي مُنَادٍ مِنَ السَّمَاءِ أَنْ كَذَبَ، فَافْرِشُوا لَهُ مِنَ النَّارِ، [وَأَلْبِسُوهُ مِنَ النَّارِ،[18]] وَافْتَحُوا لَهُ بَابًا إِلَى النَّارِ، فَيَأْتِيهِ مِنْ حَرِّهَا، وَسَمُومِهَا، وَيُضَيَّقُ عَلَيْهِ قَبْرُهُ حَتَّى تَخْتَلِفَ فِيهِ أَضْلَاعُهُ، وَيَأْتِيهِ رَجُلٌ قَبِيحُ الْوَجْهِ، قَبِيحُ الثِّيَابِ، مُنْتِنُ الرِّيحِ، فَيَقُولُ: أَبْشِرْ بِالَّذِي يَسُوءُكَ، هٰذَا يَوْمُكَ الَّذِي كُنْتَ تُوعَدُ، فَيَقُولُ: مَنْ أَنْتَ؟ فَوَجْهُكَ الْوَجْهُ يَجِيءُ بِالشَّرِّ، فَيَقُولُ: أَنَا عَمَلُكَ الْخَبِيثُ،[19] [وَاللّٰهِ مَا عَلِمْتُكَ إِلَّا كُنْتَ بَطِيئًا عَنْ طَاعَةِ اللّٰهِ

سَرِيعًا إِلَى مَعْصِيَةِ اللّٰهِ[20]] فَيَقُولُ: رَبِّ لَا تُقِمِ السَّاعَةَ، [رَبِّ لَا تُقِمِ السَّاعَةَ[21]]».

اِنھی براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم انصار کے ایک شخص کے جنازے میں شرکت کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے اور اُس کی قبر کے پاس پہنچے، جو ابھی کھودی نہیں گئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں پہنچ کر بیٹھ گئے اور ہم بھی آپ کے گرد بیٹھ گئے۔ (اُس وقت ہم ایسے خاموش تھے)، جیسے ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔ آپ نگاہ اُٹھا کر کبھی آسمان کی طرف اور کبھی نیچی کر کے زمین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آپ کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی، جس سے آپ زمین کو کرید رہے تھے۔ پھر آپ نے سر اٹھا کر دو یا تین مرتبہ فرمایا: قبر کے عذاب سے بچنے کے لیے اللہ کی پناہ مانگا کرو۔ پھر فرمایا کہ بندۂ مومن جب دنیا کو چھوڑ کر آخرت کی طرف روانہ ہونے لگتا ہے تو آسمان سے اُس کے پاس بہت سے فرشتے آتے ہیں، روشن چہرے والے، گویا چمکتا ہوا سورج ہیں۔ اُن کے پاس جنت کا ایک کفن اور وہاں کی ایک خوشبو ہوتی ہے، وہ اُس کے سامنے تا حد نگاہ بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر موت کا فرشتہ آ کر اُس کے سرہانے بیٹھ کر کہتا ہے: اے مطمئن اور پاکیزہ نفس، اپنے رب کی مغفرت اور اُس کی خوشنودی کی طرف باہر نکل آ۔ فرمایا کہ پھر اُس کی روح اِس طرح نکلتی ہے، جیسے مشکیزے کے منہ سے پانی کا قطرہ بہتا ہے، چنانچہ ملک الموت اُسے لیتا ہے اور پھر اگلے ہی لمحے دوسرے فرشتے اُس سے یہ روح لے کر وہی خوشبو اُسے لگاتے اور وہی کفن اُسے پہنا دیتے ہیں۔ پھر اُس سے مشک کی ایسی خوشبو پھیلتی ہے جیسے بہترین مشک کا ایک خوشگوار جھونکا زمین پر محسوس ہونے لگا ہو۔ فرمایا کہ پھر فرشتے اُس روح کو لے کر اوپر چلے جاتے ہیں اور فرشتوں کے جس گروہ پر بھی اُن کا گزر ہوتا ہے، وہ اُن سے پوچھتا ہے: یہ پاکیزہ روح کس کی ہے؟ یہ جواب میں فلاں بن فلاں کہہ کر اُس کا وہ بہترین نام بتاتے ہیں جس سے دنیا میں لوگ اُسے پکارتے تھے، یہاں تک کہ یہ اُس روح کو لے کر آسمان دنیا تک پہنچ

جاتے اور اُس کے لیے وہاں کے دروازے کھٹکھٹاتے ہیں تو ان کے لیے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور پھر ہر آسمان کے قریبی فرشتے اُس کو لے کر اگلے آسمان تک پہنچاتے ہیں، یہاں تک کہ اُس کو ساتویں آسمان تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے کا نامۂ اعمال علیین میں لکھ کر محفوظ کر دو اور اِسے واپس زمین کی طرف لے جاؤ، اِس لیے کہ میں نے اپنے بندوں کو زمین کی مٹی ہی سے پیدا کیا ہے، اِسی میں اِن کو لوٹاؤں گا اور اِسی سے ایک مرتبہ پھر نکالوں گا۔ چنانچہ اُس کو زمین کی طرف واپس بھیج دیا جاتا ہے۔ پھر اُس کی روح اُس کے جسم میں لوٹا دی جاتی ہے[1]، پھر دو فرشتے اُس کے پاس آتے ہیں جو اُس کو بٹھا کر پوچھتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ وہ جواب میں کہتا ہے: میرا رب اللہ ہے۔ پھر وہ اُس سے پوچھتے ہیں کہ تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے: میرا دین اسلام ہے۔ پھر وہ اُس سے پوچھتے ہیں کہ یہ کون شخص ہے جو تمھاری طرف بھیجا گیا تھا؟ وہ جواب دیتا ہے: یہ اللہ کے رسول ہیں۔ وہ اُس سے پوچھتے ہیں کہ (اِن کے بارے میں) تم کیا جانتے ہو؟ وہ جواب میں کہتا ہے: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے پاس واضح نشانیاں لے کر آئے تھے، چنانچہ میں اِن پر ایمان لایا اور اِن کی تصدیق کی تھی[2]۔ پھر وہ اُس سے کہتے ہیں کہ تمھارا علم کیا ہے؟ وہ کہتا ہے: میں نے اللہ کی کتاب پڑھی ہے، اُس پر ایمان لایا ہوں اور اُس کی تصدیق کی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ یہی بات ہے جو اللہ تعالیٰ کے ارشاد: '﴿يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ﴾'، ''ایمان والوں کو اللہ اِسی محکم بات سے دنیا اور آخرت، (دونوں) کی زندگی میں ثبات عطا فرمائے گا'' (ابراہیم ۱۴: ۲۷) میں بیان ہوئی ہے۔ فرمایا کہ اِس کے بعد آسمان سے ایک منادی پکارتا ہے کہ میرے بندے نے بالکل سچ کہا ہے، اِس کے لیے جنت کا بستر بچھا دو، اِسے جنت کا لباس پہناؤ اور اِس کے لیے جنت کا ایک دروازہ کھول دو۔ چنانچہ اُسے جنت کی ہوائیں اور خوشبوئیں آنا شروع ہو جاتی ہیں اور اُس کی قبر کو تاحد نگاہ وسیع کر دیا جاتا ہے اور اُس کے پاس ایک خوب صورت آدمی، خوب صورت لباس میں اور خوشبو میں مہکتا ہوا آتا ہے اور اُس سے کہتا ہے کہ تمھیں یہ خوش خبری مبارک ہو، یہ وہی دن ہے

جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ وہ اُس سے پوچھتا ہے: اللہ تم پر رحم فرمائے، تم کون ہو؟ تمھارا تو چہرہ ہی خیر کا پیغام بر ہے۔ وہ جواب دیتا ہے کہ میں تمھارا نیک عمل ہوں، بخدا میں جانتا ہوں کہ تم ہمیشہ اللہ کی فرماں برداری میں چست اور اُس کی نافرمانی میں سست رہے ہو، لٰہذا اب اللہ تمھیں اِس کی بہترین جزا دے گا۔ پھر وہ مردہ تین مرتبہ پکارتا ہے کہ اے میرے رب، (جلد) قیامت قائم فرما تاکہ میں اپنے اہل خانہ اور اپنے مال کی طرف [۳۱] لوٹ جاؤں۔ فرمایا کہ (اِس کے برخلاف) جب کافر دنیا کو چھوڑتا اور آخرت کی طرف روانہ ہونے لگتا ہے تو اُس کے پاس بھی آسمان سے بہت سے فرشتے آتے ہیں، سیاہ چہرے والے، جن کے پاس ٹاٹ کے کپڑے ہوتے ہیں، وہ اُس کے سامنے تاحد نگاہ بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر موت کا فرشتہ آ کر اُس کے سرہانے بیٹھ کر کہتا ہے: اے ناپاک نفس، اللہ کی ناراضی اور اُس کے غصے کی طرف باہر نکل آ۔ یہ سن کر اُس کی روح جسم میں منتشر ہونے لگتی ہے، لیکن ملک الموت اُس کو جسم سے اِس طرح کھینچ لیتا ہے، جیسے گیلی اون سے سیخ کو کھینچا جاتا ہے۔ سو وہ اُس کو لیتا ہے اور اگلے ہی لمحے دوسرے فرشتے اُس سے یہ روح لے کر اُنھی ٹاٹ کے کپڑوں میں اُس کو ڈال دیتے ہیں۔ اُس وقت اُس سے ایسی بو اُٹھتی ہے، گویا روے زمین پر پایا جانے والا سڑے ہوئے مردار کی بدبو کا بدترین جھونکا ہے۔ پھر وہ فرشتے اُس کو لے کر اوپر چلے جاتے ہیں اور فرشتوں کے جس گروہ پر بھی اُن کا گزر ہوتا ہے، وہ اُن سے پوچھتا ہے کہ یہ ناپاک روح کس کی ہے؟ یہ جواب میں فلاں بن فلاں کہہ کر اُس کا وہ بدترین نام بتاتے ہیں جس سے دنیا میں اُس کو پکارا جاتا تھا، یہاں تک کہ یہ اُس روح کو لے کر آسمان دنیا تک پہنچتے ہیں، وہاں اُس کے لیے دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے، لیکن وہ اُس کے لیے نہیں کھولا جاتا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی کہ: '﴿لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ﴾'، ''اُن کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ ہرگز جنت میں داخل نہیں ہوں گے، جب تک اونٹ سوئی کے ناکے سے نہ گزر جائے'' (الاعراف ۷: ۴۰)۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اِس کے اعمال نامے کو سجین میں لکھ کر

نچلی زمین میں محفوظ کر دو اور اِس کو واپس اِسی زمین کی طرف لے جاؤ، اِس لیے کہ میں نے اپنے بندوں کو زمین کی مٹی ہی سے پیدا کیا ہے، اِسی میں اِن کو لوٹاؤں گا اور اِسی سے ایک مرتبہ پھر نکالوں گا۔ فرمایا کہ اُس کی روح کو اوپر ہی سے پھینک دیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس کے بعد یہ آیت تلاوت فرمائی: '﴿وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ﴾'، ''اور (یاد رکھو کہ) جو اللہ کے شریک ٹھیراتا ہے تو گویا وہ آسمان سے گر پڑا ہے۔ اب پرندے اُس کو اچک لے جائیں گے یا ہوا اُس کو کسی دور دراز جگہ پر لے جا کر پھینک دے گی'' (الحج ۲۲: ۳۱)۔ (فرمایا): وہ زمین کی طرف واپس بھیج دیا جاتا ہے۔ پھر اُس کی روح اُس کے جسم میں لوٹا دی جاتی ہے۔ پھر سخت جھڑکنے والے دو فرشتے اُس کے پاس آتے ہیں اور اُس کو جھڑک کر بٹھاتے اور اُس سے پوچھتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ وہ جواب دیتا ہے: ہائے افسوس، میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ اُس سے پوچھتے ہیں کہ تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے: ہائے افسوس، مجھے کچھ علم نہیں ہے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ یہ کون شخص تھا جو تمھاری طرف بھیجا گیا تھا؟ وہ جواب دیتا ہے: ہائے افسوس، مجھے کچھ نہیں معلوم۔ پھر آسمان سے ایک منادی پکارتا ہے کہ اِس نے جھوٹ بولا ہے، لہٰذا اِس کے لیے آگ کا بستر بچھاؤ، اِس کو آگ کا لباس پہناؤ اور جہنم کا ایک دروازہ اِس کے لیے کھول دو۔ چنانچہ پھر اُس کو دوزخ کی گرمی اور اُس کی لو پہنچنے لگتی ہے اور قبر کو اُس پر اتنا تنگ کر دیا جاتا ہے کہ اُس کی پسلیاں تک ایک دوسرے میں داخل ہو جاتی ہیں۔ اِس کے بعد ایک بدصورت آدمی بدنما کپڑوں اور بدبو دار حالت میں اُس کے پاس آکر اُس سے کہتا ہے کہ تجھے یہ بری خبر مبارک ہو۔ یہ وہی دن ہے جس کی تجھے وعید سنائی گئی تھی۔ وہ اُس سے پوچھتا ہے: تم کون ہو؟ تمھارا تو چہرہ ہی شر کا پتا دے رہا ہے۔ وہ جواب دیتا ہے کہ میں تمھارا برا عمل ہوں، بخدا میں جانتا ہوں کہ تم ہمیشہ اللہ کی فرماں برداری میں سست اور اُس کی نافرمانی میں چست رہے ہو۔ پھر وہ مرنے والا کہتا ہے کہ پروردگار، قیامت قائم نہ کرنا، قیامت قائم نہ کرنا۔

۱۔ یعنی اُس جسم میں، جس کے ساتھ وہ قیامت کے دن اٹھے گا اور اُس کا یہ جسم وہاں دوسروں کے لیے بھی

مرئی ہو جائے گا۔ بالبداہت واضح ہے کہ اِس سے وہ جسم ہر گز مراد نہیں ہے، جسے لوگ سپرد خاک کر دیتے یا جلا کر راکھ بنا دیتے ہیں۔ قبر میں روح و جسم کے تعلق کے بارے میں جتنے مباحث ہمارے ہاں پیدا ہوئے ہیں، وہ اِسی غلط فہمی سے پیدا ہوئے ہیں۔ قرآن نے کئی مقامات پر اِس دوسرے جسم کی صراحت فرمائی ہے، لیکن اُس کا ذکر چونکہ احوال قیامت کے ذیل میں ہوا ہے، اِس لیے لوگ اِس طرف متوجہ نہیں ہوئے کہ اُس کی ابتدا برزخ ہی سے ہو جائے گی اور مرنے والے اُسی کے ساتھ قیامت میں اپنی قبروں سے نکل کر اپنے پروردگار کے سامنے حاضر ہوں گے۔ اِس وقت یہ جسم اور اِس کے حاملین اِسی زمین میں ہیں، مگر ہمارے لیے اُسی طرح نظروں سے اوجھل ہیں، جس طرح فرشتے اور جنات اپنے اجسام کے ساتھ نظروں سے اوجھل ہیں۔ تاہم معلوم ہے کہ پیغمبروں کے سامنے وہ اپنے اصلی جسم میں اور کبھی انسانوں کی صورت میں ممثل ہو کر نمایاں بھی ہوتے رہے ہیں۔ بنی آدم کے معاملے میں یہ ظہور و خفا کس طرح ہو گا اور اُن کا یہ جسم اگر مٹی سے بنا ہے تو اُس میں یہ خاصیت کس طرح پیدا ہو جائے گی، اِس کی حقیقت ہم نہیں جانتے، لیکن اتنی بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ یہ ہر گز مستبعد نہیں ہے، اِس لیے کہ ایٹم کی سطح پر تو یہ مٹی اِس وقت بھی غیر مرئی ہی ہے۔

۲۔ اِس سے معلوم ہوا کہ براء بن عازب کی یہ مفصل روایت بھی اُنھی لوگوں کے بارے میں ہے، جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے براہ راست اتمام حجت کیا اور وہ آپ کے مومن یا کافر ہو کر اِس دنیا سے رخصت ہوئے۔

۳۔ یعنی اُس مال و منال کی طرف جو مجھے ابدی زندگی میں رہنے بسنے کے لیے دیا جائے گا۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن اصلاً مسند احمد، رقم ۱۸۵۳۴ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے راوی تنہا براء بن عازب رضی اللہ عنہ ہیں۔ اِس کے متابعات اِن مراجع میں دیکھ لیے جا سکتے ہیں: الزہد والرقائق، ابن مبارک، رقم ۱۲۱۹۔ مسند طیالسی، رقم ۷۸۹۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۰۵۹، ۱۲۰۶۰۔ الرد علی الجہمیہ، ابو سعید دارمی، رقم ۱۱۰۔ سنن ابی داؤد، رقم ۴۷۵۳، ۴۷۵۴۔ السنۃ، عبد اللہ بن احمد، رقم ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰۔ مسند رویانی، رقم ۳۹۲۔ تفسیر ابن ابی حاتم، رقم ۱۷۴۱۷، ۸۴۹۲۔ الشریعہ، آجری، رقم ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶۔ الایمان، ابن مندہ، رقم ۱۰۶۴۔ مستدرک حاکم، رقم ۱۰۷۔ شرح اصول اعتقاد اہل السنۃ والجماعۃ، لالکائی، رقم ۲۱۴۰۔ اثبات عذاب القبر،

بیہقی، رقم ۲۰، ۲۱، ۴۴۔

۲۔ الزہد والرقائق، ابن مبارک، رقم ۱۲۱۹۔

۳۔ مسند طیالسی، رقم ۷۸۹۔

۴۔ الزہد والرقائق، ابن مبارک، رقم ۱۲۱۹۔

۵۔ مسند طیالسی، رقم ۷۸۹۔

۶۔ مسند طیالسی، رقم ۷۸۹۔

۷۔ مسند طیالسی، رقم ۷۸۹۔

۸۔ السنۃ، عبد اللہ بن احمد، رقم ۱۴۳۸۔

۹۔ مسند رویانی، رقم ۳۹۲۔

۱۰۔ مسند طیالسی، رقم ۷۸۹۔

۱۱۔ الزہد والرقائق، ابن مبارک، رقم ۱۲۱۹۔

۱۲۔ بعض طرق، مثلاً مسند رویانی، رقم ۳۹۲ میں یہاں 'کافر' کے بجائے 'فاجر' کا لفظ نقل ہوا ہے۔

۱۳۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۰۵۹۔

۱۴۔ مسند طیالسی، رقم ۷۸۹ میں یہاں '«فَيُرْمَى بِهِ مِنَ السَّمَاءِ»'، ''پھر اُس کو آسمان سے (زمین کی طرف) پھینک دیا جاتا ہے'' کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

۱۵۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۰۵۹۔

۱۶۔ مسند طیالسی، رقم ۷۸۹۔

۱۷۔ اثبات عذاب القبر، بیہقی، رقم ۲۰۔

۱۸۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۰۵۹۔

۱۹۔ بعض طرق، مثلاً الزہد والرقائق، ابن مبارک، رقم ۱۲۱۹ میں یہاں 'الْخَبِيثُ' کے بجائے 'السَّيِّئُ' کا لفظ آیا ہے۔ معنی کے اعتبار سے یہاں یہ دونوں الفاظ مترادف ہیں۔

۲۰۔ مسند طیالسی، رقم ۷۸۹۔

۲۱۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۰۵۹۔

[باقی]

محمد عمار خان ناصر

”میزان“ — توضیحی مطالعہ

(۴)

تقسیم وراثت

”میزان“ کے باب ”قانون معیشت“ میں مصنف نے ”تقسیم وراثت“ کے عنوان کے تحت میراث سے متعلق شرعی احکام کی وضاحت کی ہے۔ اس بحث میں کئی اہم نکات کے حوالے سے مصنف کا نقطۂ نظر اہل علم کی عمومی رائے سے مختلف ہے۔ زیر نظر سطور میں انھی نکات کا ایک توضیحی مطالعہ پیش کیا جائے گا۔

وصیت کا حکم

”اِن آیتوں میں والدین اور قرابت مندوں کے لیے دستور کے مطابق وصیت کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ اہل عرب کا دستور تھا۔ اِس کی جگہ بعد میں اُس قانون نے لے لی جو سورۂ نساء کی آیتوں میں بیان ہوا ہے۔ والدین اور اقربا کے حصے اللہ تعالیٰ نے نساء کی اِن آیتوں میں خود متعین کر دیے ہیں اور اِنھیں اپنی وصیت قرار دیا ہے۔... لہٰذا یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ ہر مسلمان اب اِسی قانون کے مطابق وصیت کا پابند ہے اور دستور کے مطابق وصیت کا حکم باقی نہیں رہا۔“ (میزان ۵۱۸-۵۱۹)

ترکے کی تقسیم سے متعلق قرآن مجید میں دو طرح کی ہدایات دی گئی ہیں۔ سورۂ بقرہ (۲: ۱۸۰) میں مرنے

والے پر والدین اور اقربا کے لیے وصیت کرنے کو لازم قرار دیا گیا ہے، جب کہ سورۂ نساء (۴: ۱۰-۱۱) میں اللہ تعالیٰ نے ترکے میں مختلف حالات میں والدین، اولاد، بہن بھائی اور میاں بیوی کو ملنے والے متعین حصوں کا ذکر کیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں ان دونوں حکموں کے باہمی تعلق کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ:

إن الله قد أعطى كل ذي حق حقه فلا وصية لوارث.

''اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے، اس لیے اب وارث کے حق میں وصیت نہیں کی جا سکتی۔''

(ابو داؤد، رقم ۲۸۷۰)

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے کہ پہلے ضابطہ یہ تھا کہ ترکہ اولاد کو ملے گا، جب کہ والدین کے حق میں وصیت کی جائے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس میں سے جو بات منسوخ کرنا چاہی، منسوخ کر دی اور یہ قرار دیا کہ والدین میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ، بیوی کو چوتھا یا آٹھواں حصہ اور شوہر کو چوتھا حصہ یا نصف ترکہ دیا جائے (بخاری، رقم ۲۷۴۷)۔

میراث کے احکام سے، وصیت کے حکم کا عموماً منسوخ ہو جانا جمہور فقہا کے ہاں مسلم ہے، البتہ اس سوال کے حوالے سے ان میں مختلف زاویہ ہاے نگاہ پائے جاتے ہیں کہ کیا قرآن میں ورثا کے متعین حصے مقرر کیا جانا فی نفسہٖ وصیت کے حکم کے لیے ناسخ تھا یا اس تنسیخ کو ایک مستقل حکم کے طور پر اصلاً حدیث میں واضح کیا گیا ہے؟

امام بخاری نے ابن عباس کی مذکورہ روایت پر 'لا وصية لوارث' (وارث کے حق میں وصیت نہیں کی جا سکتی) کا عنوان قائم کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وصیت کے مطلق حکم کو آیت میراث سے منسوخ تصور کرتے ہیں۔

امام شافعی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ وراثت سے متعلق احکام کے نزول کے بعد وصیت کی ہدایت کے متعلق دو احتمال موجود تھے: ایک یہ کہ ترکے میں متعین حصے مقرر کیے جانے کے بعد وارثوں کے حق میں وصیت کی ہدایت کو منسوخ تصور کیا جائے، اور دوسرا یہ کہ وصیت کا حکم بھی اپنی جگہ برقرار ہو اور ورثا از روے وصیت بھی ترکے میں سے حصہ لینے کے حق دار ہوں۔ ان دونوں احتمالات میں سے پہلے احتمال کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں متعین کر دیا گیا ہے، چنانچہ آپ نے فتح مکہ کے موقع پر یہ واضح فرمایا کہ وارث کے حق میں وصیت نہیں کی جا سکتی (الام ۱/ ۵۹-۶۰)۔ امام صاحب کی راے کا حاصل یہ ہے کہ اصولی طور پر آیات میراث نے ورثا کے حق میں وصیت کے وجوب یا جواز کو منسوخ کر دیا تھا، لیکن ہمارے لیے اس کو حتمی طور پر ناسخ قرار دینا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی بنا پر ہی ممکن ہے۔

امام ابن تیمیہ بھی اسی رائے کی تائید کرتے ہیں، البتہ ان کی رائے میں خود قرآن میں اس کی واضح دلیل موجود ہے کہ والدین اور اقربا کے حق میں وصیت کی ہدایت کو آیت مواریث نے منسوخ کر دیا ہے۔ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ورثا کے حصے مقرر کرنے کے بعد اس میں تعدی کرنے پر جہنم کے عذاب کی وعید سنائی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ورثا کو مقررہ حصوں سے زیادہ دینا حدود اللہ سے تجاوز کے مترادف ہے اور اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وصیت کے ذریعے سے بھی ان حصوں میں زیادتی نہیں کی جا سکتی (مجموع الفتاویٰ ۱۹۸/۱۷)۔

شاہ ولی اللہ نے دونوں حکموں کے اس تعلق کو حکمت و مصلحت کے پہلو سے یوں واضح کیا ہے کہ چونکہ اہل جاہلیت عموماً وصیت میں عدل وانصاف کو ملحوظ نہیں رکھتے تھے اور ان کی ناانصافی اہل قرابت کے مابین نفرت و کدورت اور تنازع کا موجب بنتی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ترکے میں میت کے قریبی رشتہ داروں کے حصے خود متعین فرما دیے اور چونکہ اس اقدام کا مقصد ہی باہمی تنازعات کو ختم کرنا تھا، اس لیے از روے شرع وارث بننے والے کے حق میں وصیت کو ممنوع قرار دینا اس بندوبست کا لازمی تقاضا تھا (حجۃ اللہ البالغہ ۳۰۹/۲)۔

اہل علم کا ایک دوسرا فریق آیات میراث کو براہ راست وصیت کے حکم کے لیے ناسخ نہیں سمجھتا۔ اس کے خیال میں ظاہر کے لحاظ سے دونوں حکموں کو اپنی اپنی جگہ برقرار مانا جا سکتا ہے اور آیات میراث میں بھی اللہ تعالیٰ نے ترکے کی تقسیم سے پہلے وصیت پوری کرنے کی ہدایت فرمائی ہے جس میں، الفاظ کے ظاہری اطلاق کے لحاظ سے، ان ورثا کے حق میں وصیت کرنا بھی شامل ہے جن کے حصے آیات میراث میں بیان کیے گئے ہیں (اصول السرخسی ۶۹/۲)۔ اس فریق کے نزدیک وصیت کی حتمی تنسیخ حدیث کے ذریعے سے عمل میں آئی ہے، البتہ اس کی تفصیل کے حوالے سے ان اہل علم کے مابین مختلف رجحانات پائے جاتے ہیں۔

امام ابو منصور ماتریدی اور امام سرخسی کی رائے یہ ہے کہ والدین واقربا کے حصے مقرر کیے جانے کے بعد بدیہی طور پر وصیت کا وجوب تو منسوخ ہو گیا تھا، تاہم اس کا جواز پھر بھی باقی رہا۔ بعد میں حدیث کے ذریعے سے اس نفلی وصیت کا جواز بھی منسوخ کر دیا گیا (تاویلات اہل السنۃ ۴۷/۳، ۸۳۔ اصول السرخسی ۷۱/۲)۔

ابن حزم بھی احکام میراث کو آیت وصیت کے لیے ناسخ نہیں سمجھتے۔ ان کا کہنا ہے کہ از روے میراث ترکے میں حصہ ملنے اور از روے وصیت مال کا حق دار ہونے میں کوئی تضاد نہیں اور یہ دونوں بہ یک وقت قابل عمل ہو سکتے ہیں۔ تاہم اس کے بعد جن اقربا، (یعنی والدین، اولاد اور زوجین وغیرہ) کے باقاعدہ حصے شریعت میں طے

کر دیے گئے ہیں، ان کے حق میں وصیت کی اجازت سنت کے ذریعے سے منسوخ کر دی گئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے 'لا وصیة لوارث' کے الفاظ سے اس کی وضاحت فرما دی۔ البتہ یہ تنسیخ چونکہ صرف وارث بننے والے اقربا کے حوالے سے ہے، اس لیے ایسے اقربا جن کا ترکے میں کوئی متعین حصہ مقرر نہیں کیا گیا، ان کے لیے وصیت کرنا سابقہ حکم کے تحت اب بھی فرض ہے اور اس میں کوئی نسخ واقع نہیں ہوا (احکام الاحکام ۹۲/۴، ۱۱۳-۱۱۴)۔

مصنف نے یہاں فقہا کے پہلے گروہ سے اتفاق کیا ہے جن کی رائے میں والدین واقربین کے لیے وصیت کرنے کی جو ہدایت سورۂ بقرہ میں دی گئی تھی، سورۂ نساء میں میراث کا قانون نازل ہو جانے کے بعد وہ منسوخ ہو چکی ہے۔ اس حوالے سے ''البیان'' میں مصنف نے درج ذیل تین استدلالات پیش کیے ہیں:

اولاً، اللہ تعالیٰ نے یہ حصے یہ کہہ کر مقرر فرمائے ہیں کہ لوگ یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ ان کے وارثوں میں سے کون بہ لحاظ منفعت ان سے قریب تر ہے، اس لیے اس کے بعد وارثوں کے لیے وصیت کرنے کا مطلب یہ بنتا ہے کہ کوئی شخص اللہ کے فیصلے سے بہتر فیصلہ کرنے کا دعویٰ کر رہا ہے۔

ثانیاً، اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو اپنی وصیت قرار دیا ہے اور اس کے بعد کوئی وصیت کرنا گویا اللہ کے مقابلے میں اپنی وصیت کو پیش کرنا ہے۔

ثالثاً، ان حصوں کو اللہ تعالیٰ نے 'نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا'، یعنی بالکل متعین حصوں سے تعبیر کیا ہے جن کو کسی وصیت سے باطل نہیں کیا جا سکتا (البیان ۱/۱۹۰)۔

حاصل یہ ہے کہ مصنف کے نزدیک ورثا کے لیے حق وصیت کا اصل ناسخ آیات میراث ہی ہیں، جب کہ 'لا وصیة لوارث' کی حدیث محض اس کا بیان ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے بھی اس حدیث کی تفہیم اسی اصول پر کی ہے (تدبر قرآن ۲/۲۶۱)۔

وارثوں کے حق میں وصیت

> ''...اللہ کی طرف سے اِس قانون کے نازل ہو جانے کے بعد اب کسی مرنے والے کو رشتہ داری کی بنیاد پر اللہ کے ٹھیرائے ہوئے وارثوں کے حق میں وصیت کا اختیار باقی نہیں رہا۔... تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وارثوں کی کوئی ضرورت یا اُن میں سے کسی کی کوئی خدمت یا اِس طرح کی کوئی دوسری چیز تقاضا کرے تو اِس صورت میں بھی اُن کے حق میں وصیت نہیں کی جا سکتی۔ آیت میں جس منفعت کے کم یا زیادہ ہونے کا علم

اللہ تعالیٰ کے لیے خاص قرار دیا گیا ہے، وہ رشتہ داری کی منفعت ہے۔ اِس کا اُن ضرورتوں اور منفعتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے جو ہمارے لیے معلوم اور متعین ہوتی ہیں۔ اِس لیے یہ وصیت کی جا سکتی ہے، مگر اللہ کی وصیت کے مقابلے میں کوئی مسلمان اب رشتہ داری کی بنیاد پر اپنی کوئی وصیت پیش کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ 'مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ' کے جو الفاظ اِن آیتوں میں بار بار آئیں گے، اُن سے مراد بھی ایسی ہی کوئی وصیت ہے جو وارثوں کے سوا کسی دوسرے کے حق میں ہو یا وارثوں کی کسی ضرورت کے لیے یا اُن کی کسی خدمت کے صلے میں خود اُن کے حق میں کی جائے۔'' (میزان ۵۲۴-۵۲۵)

جمہور فقہا کے نزدیک قرآن مجید میں مختلف وارثوں کے حصے مقرر کر دیے جانے اور 'لا وصية لوارث' کی مذکورہ روایت کی روشنی میں مرنے والے کے لیے ورثا کے حق میں وصیت کرنا جائز نہیں، تاہم اگر ایسا ورثا کی رضامندی سے ہو یا وہ اس وصیت کو جائز قرار دے دیں تو پھر وہ نافذ ہو جائے گی۔

فقہاے امامیہ اور زیدیہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جس طرح غیر وارث کے حق میں وصیت کی جا سکتی ہے، اسی طرح ورثا کے حق میں بھی کی جا سکتی ہے، چاہے ورثا اس پر رضامند ہوں یا نہ ہوں۔ اس ضمن میں فقہاے امامیہ 'لا وصية لوارث' کے ارشاد نبوی کو اس صورت سے متعلق قرار دیتے ہیں جب وصیت ترکے کے ایک تہائی سے متجاوز ہو اور شیعہ ذخیرۂ حدیث میں مروی بعض روایات میں اس قید کی تصریح بھی موجود ہے (شوکانی، نیل الاوطار ۹/ ۱۳۹۔ محمد جواد مغنیۃ، الفقہ علی المذاہب الخمسۃ ۴۶۵)۔

امام ابن جریر طبری نے بعض تابعین کے آثار کی روشنی میں اس نقطۂ نظر کو ترجیح دی ہے کہ یہ آیت مرنے والے کے ایسے والدین اور اقربا کے حق میں محکم ہے جو کسی وجہ سے، (مثلاً غیر مسلم ہونے کے باعث) وراثت سے محروم ہو رہے ہوں۔ ابن جریر کے نزدیک ایسے رشتہ داروں کے لیے وصیت کرنا مرنے والے پر واجب ہے (جامع البیان ۳/ ۳۸۴-۳۸۵)۔

ماضی قریب کے اہل علم میں سے مفتی محمد عبدہ نے یہ راے اختیار کی ہے کہ والدین اور اقربا کے لیے وصیت کی ہدایت، احکام میراث کے نزول سے منسوخ نہیں ہوئی اور دونوں ہدایات اپنی جگہ برقرار ہیں، تاہم ان کا محل الگ الگ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اقربا کو وراثت کے مقررہ حصے قرابت داری کی بنیاد پر دیے ہیں، جب کہ مرنے والے کو پابند کیا ہے کہ وہ ان میں سے کسی کی خصوصی ضرورت اور احتیاج کے پیش نظر اس کے لیے وصیت بھی کر دے۔ لکھتے ہیں:

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

وجوز بعض السلف الوصية للوارث نفسه بأن يخص بها من يراه أحوج من الورثة كأن يكون بعضهم غنيًا والبعض الآخر فقيرًا – مثال ذالك أن يطلق أبوه أمه وهو غني وهي لا عائل لها إلا ولدها ويرى أن ما يصيبها من التركة لا يكفيها – ومثله أن يكون بعض ولده أو إخوته إن لم يكن له ولد عاجزًا عن الكسب فنحن نرى أن الحكيم الخبير اللطيف بعباده الذي وضع الشريعة والأحكام لمصلحة خلقه لا يحتم أن يساوي الغني الفقير والقادر على الكسب من يعجز عنه – فإذا كان وضع أحكام المواريث العادلة على أساس التساوي بين الطبقات باعتبار أنهم سواسية في الحاجة كما أنهم سواء في القرابة فلا غرو أن يجعل أمر الوصية مقدمًا على أمر الإرث أو يجعل نفاذ هذا مشروطًا بنفاذ ذالك قبله ويجعل الوالدين والأقربين في آية أخرى أولى بالوصية لهم من

”اور بعض سلف نے خود وارث کے لیے بھی اس صورت میں وصیت کرنے کو درست قرار دیا ہے کہ مرنے والا ورثا میں سے زیادہ ضرورت مند کے لیے خصوصی وصیت کر دے، جب کہ بعض ورثا مال دار اور بعض محتاج ہوں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کسی کا والد اس کی ماں کو طلاق دے دے اور وہ آدمی خود تو مال دار ہو، لیکن اس کی بیوی کی کفالت کرنے والا اس کے علاوہ کوئی نہ ہو اور اولاد یہ محسوس کرے کہ ترکے میں سے جو کچھ ماں کو ملے گا، وہ اس کے لیے کافی نہیں ہو گا۔ اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی آدمی کے کچھ بچے یا اولاد کی غیر موجودگی میں اس کے بہن بھائی کمانے سے عاجز ہوں۔ پس ہماری رائے میں حکیم و خبیر اور اپنے بندوں کے ساتھ مہربان ذات جس نے شریعت اور احکام کو اپنی مخلوق کی مصلحت کے لیے مقرر فرمایا ہے، یہ لازم نہیں کرتی کہ مال دار اور فقیر کو اور اسی طرح کمانے پر قادر اور کمانے سے عاجز وارثوں کو ایک ہی درجے میں رکھا جائے۔ پس جب میراث کے عادلانہ احکام کی بنیاد مختلف طبقوں کے مابین برابری پر ہے، اس لحاظ سے کہ وہ حاجت و ضرورت میں بھی ایک جیسے ہیں، جیسا کہ قرابت

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

غيرهم لعلمه سبحانه وتعالى بما يكون من التفاوت بينهم في الحاجة أحيانًا.(تفسیر المنار ۲/۱۳۶-۱۳۷)

میں یکساں ہیں، تو اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ وصیت کے معاملے کو وراثت پر مقدم رکھا جائے یا وراثت کی تقسیم کو اس سے پہلے وصیت کی تنفیذ سے مشروط قرار دیا جائے، جب کہ دوسری آیت میں والدین یا اقربا کے متعلق کہا جائے کہ وہ باقی رشتہ داروں سے زیادہ وصیت کیے جانے کا حق رکھتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ ان کے مابین بعض حالات میں ضرورت و حاجت کے اعتبار سے تفاوت ہو سکتا ہے۔''

مصنف کا موقف یہاں نتیجے کے لحاظ سے مفتی محمد عبدہ کے نقطۂ نظر سے ہم آہنگ ہے، تاہم دونوں کا منہج استدلال مختلف ہے۔ مفتی محمد عبدہ، آیت وصیت اور آیات میراث، دونوں کو الگ الگ اور مستقل احکام مانتے ہیں جن کے مابین کوئی نسخ واقع نہیں ہوا اور ان دونوں کے مجموعے سے یہ بات اخذ ہوتی ہے کہ مرنے والے کو والدین اور دیگر اقربا کی ضرورت کے لحاظ سے، خاص حالات میں الگ سے وصیت کرنے کا بھی اختیار ہے۔ اس کے برخلاف، مصنف کے نزدیک آیت وصیت میں تقسیم وراثت کے حوالے سے ایک عبوری ہدایت دی گئی تھی جو آیت میراث کے نزول کے بعد منسوخ ہو چکی ہے، تاہم وہ اس تنسیخ کو ترکے میں استحقاق کے صرف ایک اصول، یعنی قرابت داری سے متعلق قرار دیتے ہیں۔ جہاں تک دوسرے اصول، یعنی ضرورت و حاجت کا تعلق ہے تو وہ ایک مستقل اصول ہے اور آیت میراث کے بعد بھی قائم ہے۔ اس استدلال کی رو سے، مصنف وصیت کی اس ممانعت کو اس صورت سے متعلق نہیں سمجھتے جب، رشتہ داری کے عمومی تعلق سے ہٹ کر، وارثوں کی کسی خاص ضرورت کے پیش نظر یا ان کی کسی خدمت کے صلے میں مرنے والا ان کو اپنے ترکے میں سے کچھ دینا چاہے۔

اس ضمن میں سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۲۴۰ میں وارد وصیت کی ہدایت کے متعلق اہل علم کے اختلاف کو سامنے رکھنا بھی اہم ہے۔ مذکورہ آیت میں اس کی تاکید کی گئی ہے کہ مرنے والے کو چاہیے کہ وہ اپنی بیوی کے

بارے میں یہ وصیت کر کے جائے کہ اس کے مرنے کے بعد ایک سال تک اسے اسی گھر میں رہنے دیا جائے اور اسے سامان زندگی بھی فراہم کیا جائے۔ جمہور فقہا اس ہدایت کو، میراث کی آیات سے منسوخ قرار دیتے ہیں، تاہم دوسری رائے یہ ہے کہ یہ ہدایت اپنی جگہ برقرار ہے اور اگر واجب نہیں تو کم سے کم اسے مستحب قرار دینے میں کوئی مانع نہیں (شاہ ولی اللہ، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر ۴۸۔ تعریب: محمد انور البدخشانی، بیت العلم کراچی، ۲۰۰۶ء)۔ مصنف کے نزدیک یہ ہدایت وجوب پر محمول ہے اور اس کی حیثیت ایک محکم حکم کی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

> ”عام طور پر لوگ اِس حکم کو سورۂ نساء میں تقسیم وراثت کی آیات سے منسوخ مانتے ہیں، لیکن صاف واضح ہے کہ عورت کو نان و نفقہ اور سکونت فراہم کرنے کی جو ذمہ داری شوہر پر اُس کی زندگی میں عائد ہوتی ہے، یہ اُسی کی توسیع ہے۔ عدت کی پابندی وہ شوہر ہی کے لیے قبول کرتی ہے۔ پھر اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے بھی اُسے کچھ مہلت لازماً ملنی چاہیے۔ یہ حکم اِن مصلحتوں کے پیش نظر دیا گیا ہے، تقسیم وراثت سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔“ (میزان ۴۶۴)

اب اگر یہ ہدایت منسوخ نہیں ہے تو پھر ورثا کے حق میں بربنائے ضرورت کسی وصیت کے مسئلے میں یہ ایک اہم محل استشہاد بن جاتی ہے۔ اگر قرآن نے بیوہ کے لیے ایک سال تک سامان زندگی کی وصیت کرنے کی ہدایت دراصل اس کی ضرورت و احتیاج اور مخصوص حالات کے پیش نظر دی ہے اور اس کے لیے یہ انتظام میت کے ترکے میں سے وراثت کے متعین حصے کے علاوہ ہی کیا جائے گا تو اس سے یہ بات اخذ کی جا سکتی ہے کہ رشتہ داری سے ہٹ کر کچھ ایسی اضافی وجوہ، مثلاً ضرورت و احتیاج، ہو سکتی ہیں جن کے پیش نظر وارث کے حق میں معمول کے حصے کے علاوہ زائد مال کی وصیت بھی کی جائے۔

وصیت میں ایک تہائی کی تحدید

وصیت کے مسئلے میں مصنف کا ایک اہم اختلاف وصیت کی تحدید سے متعلق ہے۔ جمہور فقہا کے نزدیک مرنے والے کا، اپنے مال میں وصیت کرنے کا اختیار ترکے کے ایک تہائی تک محدود ہے۔ اس رائے کی بنیاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر ہے جو آپ نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو دی تھی۔ سعد نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ میرے پاس کافی مال ہے، جب کہ میری وارث صرف ایک بیٹی ہے تو کیا میں اپنا دو تہائی مال صدقہ کر دوں؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔ سعد نے پوچھا کہ نصف مال صدقہ کر دوں؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔ اس

کے بعد آپ نے فرمایا:

الثلث والثلث کبیر أو کثیر إنک إن تذر ورثتک أغنیاء خیر من أن تذرھم عالة یتکففون الناس.
(بخاری، رقم ۱۲۹۵)

''تم تیسرا حصہ صدقہ کر سکتے ہو، لیکن یہ بھی زیادہ ہے۔ تم اگر اپنے وارثوں کو غنی چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو تو یہ اس سے بہتر ہے کہ تم انھیں فقر و احتیاج کی حالت میں چھوڑ کر جاؤ اور وہ لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرتے رہیں۔''

اس روایت سے فقہا یہ استدلال کرتے ہیں کہ کسی آدمی کا اپنے مال میں وصیت کرنے کا حق ایک تہائی تک محدود ہے اور اس سے زاید اگر وہ کسی کے حق میں وصیت کرے گا تو وہ غیر معتبر ہو گی۔ فقہا مذکورہ حدیث کو قرآن کی تخصیص کی مثال کے طور پر بھی پیش کرتے ہیں۔ جہاں تک اس روایت سے استدلال کا تعلق ہے تو بظاہر اس کے سیاق و سباق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ کے پیش نظر یہاں کسی باضابطہ شرعی تحدید کا بیان نہیں، بلکہ صورت حال کے لحاظ سے محض ایک مناسب مشورہ دینا ہے۔ امام شافعی نے مذکورہ حدیث کے حوالے سے اس امکان کو تسلیم کرتے ہوئے یہ استدلال کیا ہے کہ بعض دیگر روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فیصلوں میں ایک تہائی کی تحدید کو ملحوظ رکھا ہے (الام)۔ مثال کے طور پر عمران بن حصین اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما کی روایات میں نقل کیا گیا ہے کہ ایک آدمی کے پاس چھ غلام تھے اور اس نے مرتے وقت انھیں آزاد کر دیا، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مابین قرعہ ڈالا اور دو کو آزاد کر کے چار غلاموں کو اس کے وارثوں کی ملکیت میں دے دیا (مسلم، رقم ۱۶۶۸)۔ روایت کے بعض طرق میں اس کو یوں تعبیر کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کے تیسرے حصے میں اس کا تصرف نافذ قرار دیا اور باقی چار غلام اس کے ورثا کی تحویل میں دے دیے۔

بہر حال روایات و آثار سے واضح ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد بن ابی وقاص کو جو ہدایت فرمائی تھی، مسلمانوں میں عمومی طور پر اسی پر تعامل جاری ہو گیا اور اسی کو ایک قانونی تحدید کے طور پر قبول کر لیا گیا۔ عطاء کا بیان ہے:

قال فالثلث؟ فسکت النبي صلی اللہ علیه وسلم فمضی بذالک الأمر.

''سعد نے پوچھا کہ ایک تہائی؟ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے اور پھر اسی

پر معاملہ جاری ہو گیا۔“ (مصنف عبد الرزاق، رقم ۱۶۳۶۰)

صحابہ وتابعین کے عہد میں اس تحدید کی پابندی اتنی اہم سمجھی جاتی تھی کہ عبد اللہ بن مسعود، ابراہیم نخعی، قاضی شریح، شعبی، طاؤس اور حکم جیسے جلیل القدر فقہا کی رائے یہ تھی کہ اگر مرنے والا، آخری وقت میں کسی کے حق میں ایک تہائی ترکے سے زیادہ وصیت کرنا چاہے اور ورثا اس کو جائز قرار دے دیں تو بھی اس کی وفات کے بعد انھیں اس فیصلے پر نظر ثانی کا اختیار ہوگا، کیونکہ انھوں نے پہلے جو اجازت دی، وہ حقیقی رضامندی سے نہیں، بلکہ مرنے والے کی دل جوئی کے جذبے سے ہو سکتی ہے (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۱۳۶۵-۳۱۳۷۵)۔

اس ضمن میں اختلافی زاویۂ نظر غالباً سب سے پہلے مولانا فراہی نے پیش کیا۔ مولانا اس تحدید کی تائید میں قرآن سے یہ استنباط پیش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ترکے میں تین حقوق بیان فرمائے ہیں، یعنی ورثا کے حصے، مرنے والے کی وصیت اور قرض کی ادائیگی۔ اس سہ گانہ تقسیم سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تینوں مدات کے لیے ترکے کا ایک ایک حصہ صرف کیا جانا چاہیے۔ تاہم مولانا کے نزدیک چونکہ یہ مقدار قرآن نے نصاً بیان نہیں کی، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس سے زیادہ وصیت کرنے کو حرام قرار نہیں دیا، بلکہ اس طرف توجہ دلائی کہ اس سے زیادہ وصیت تقسیم وراثت کے احکام کے مقاصد اور حکمتوں کے خلاف ہے۔ مولانا کی رائے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ یہ بات ایک خاص واقعے میں ارشاد فرمائی ہے، اس لیے اسے منصوص معنوں میں عمومی ممانعت نہیں سمجھا جا سکتا، البتہ مصلحت کے پہلو سے اس کی عمومی پابندی کرنا مناسب ہے تاکہ ورثا کے حق کی حفاظت کی جا سکے (احکام الاصول ۲)۔

مصنف کا زاویۂ نظر اس سوال کے حوالے سے یہ ہے کہ اصولی طور پر وصیت کی تحدید کی بنیاد تو قرآن میں موجود ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وصیت کا حق بیان کرتے ہوئے یہ تاکید کی ہے کہ کسی حق دار کو ضرر نہ پہنچایا جائے۔ مصنف کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر بحث ہدایت بھی اسی اصول پر مبنی ہے (البیان ۱/ ۴۵۶-۴۵۷۔ میزان ۵۳۰-۵۳۱)۔ تاہم مصنف کو مولانا فراہی کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ ”یہ خاص صورت حال میں ایک خاص شخص کے فیصلے پر آپ کا تبصرہ ہے۔ اس کا کسی قانونی تحدید سے کوئی تعلق نہیں ہے“ (مقامات ۲۸۴)۔ قرآن کے اسلوب سے اس تحدید کے استحباب کا جو قرینہ مولانا فراہی نے ذکر کیا ہے، مصنف اس کو درست نہیں سمجھتے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ ”قرآن کے الفاظ میں کسی تحدید کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے علی الاطلاق فرمایا ہے کہ یہ تقسیم مرنے والے کی وصیت پوری کرنے کے بعد کی جائے گی۔

زبان وبیان کے کسی قاعدے کی رو سے اس اطلاق پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی'' (مقامات ۲۸۳)۔

گویا مصنف کا زاویۂ نظر یہ ہے کہ اس معاملے میں اصل چیز عدل وانصاف اور ورثا کے حقوق کا لحاظ رکھنا ہے اور اگر کوئی مورث اس کو نظر انداز کر کے وصیت کرنا چاہے تو نظم اجتماعی اس میں مداخلت کر کے معاملے کی اصلاح کر سکتا ہے۔ تاہم مورث کو کتنے مال کی وصیت کرنے کا حق ہونا چاہیے، اس کا تعلق اجتہاد سے ہے اور قاضی کو ہر مقدمے کی انفرادی صورت حال کے لحاظ سے فیصلہ کرنا چاہیے۔

اولاد کی میراث

''فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً'، 'لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ' سے استثنا اور اِسی کے ایک پہلو کی وضاحت ہے۔ ہماری یہ بات اگر صحیح ہے تو اِسے پھر 'وَلِاَبَوَيْهِ' کی طرح اپنے مقام پر مستقل نہیں مانا جا سکتا۔ اِس کا حکم وہی ہونا چاہیے جو 'لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ' کا ہے۔... یہ اگر ملحوظ رہے تو اِس بات کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی کہ 'وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ' کے بعد والدین اور زوجین کے جو حصے حرف 'و' سے اولاد کے حصوں پر عطف ہوئے ہیں، وہ سب لازماً پہلے دیے جائیں گے اور اِس کے بعد جو کچھ بچے گا، صرف وہی اولاد میں تقسیم ہو گا۔ لڑکے اگر تنہا ہوں تو اُنھیں بھی یہی ملے گا اور لڑکے اور لڑکیاں، دونوں ہوں تو اُن کے لیے بھی یہی قاعدہ ہو گا۔ اِسی طرح میت کی اولاد میں اگر تنہا لڑکیاں ہی ہوں تو اُنھیں بھی اِس بچے ہوئے ترکے ہی کا دو تہائی یا آدھا دیا جائے گا، اُن کے حصے پورے ترکے میں سے کسی حال میں ادا نہ ہوں گے۔''

(میزان ۵۲۲)

ان آیات میں اولاد کے وارث ہونے کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں: ایک یہ کہ اولاد میں بیٹے اور بیٹیاں دونوں ہوں۔ اس صورت میں بیٹوں کو بیٹیوں سے دوگنا حصہ دیا جائے گا۔ دوسری یہ کہ صرف بیٹیاں ہوں اور ان کی تعداد دو یا دو سے زائد ہو۔ اس صورت میں وہ دو تہائی کی حق دار ہوں گی۔ تیسری یہ کہ صرف ایک بیٹی ہو۔ اس صورت میں اسے ترکے کا نصف حصہ دیا جائے گا۔

یہاں جمہور اہل علم سے مصنف کا اہم ترین اختلاف اس حوالے سے ہے کہ جمہور کے نزدیک مذکورہ تین میں سے پہلی صورت میں تو باقی ورثا کے حصے دے دیے جانے کے بعد باقی ترکہ ایک اور دو کی نسبت سے بیٹوں اور بیٹیوں میں تقسیم کیا جائے گا، جب کہ صرف ایک بیٹی یا دو بیٹیاں ہونے کی صورت میں انھیں باقی ماندہ ترکے کا نہیں، بلکہ کل ترکے کا نصف یا دو تہائی ملے گا۔ مصنف کے نزدیک ان تینوں صورتوں میں اولاد کو ترکے میں

سے حصہ باقی ورثا کے حصے ادا کرنے کے بعد ہی دیا جائے گا۔ یہی اختلاف اس صورت میں ہے جب، سورۂ نساء کی آخری آیت کی رو سے، اولاد کی غیر موجودگی میں مرنے والے کے بہن بھائی اسی تفصیل کے مطابق ترکے میں سے حصہ پا رہے ہوں۔

مصنف نے اس موقف کے حق میں یہ استدلال کیا ہے کہ زیر بحث آیات کی ابتدا میں 'يُوۡصِيۡكُمُ اللّٰهُ فِيۡۤ اَوۡلَادِكُمۡ‌ ۗ لِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ' کے اسلوب سے یہ واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ ترکے کا وارث اصلاً مرنے والے کی اولاد کو بنانا چاہتے ہیں، جب کہ ماں باپ اور میاں بیوی کو ثانوی طور پر اور فی الجملہ حصہ دار بنانا مقصود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیٹوں اور بیٹیوں کے حصے متعین کرنے کے بجاے 'لِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے جس کی تعیین باقی ورثا کے حصے دیے جانے کے بعد ہی ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد دو بیٹیوں یا ایک بیٹی کا حصہ بھی اسی اصول کے تحت بیان کیا گیا ہے اور یہاں دو تہائی یا نصف سے مراد کل ترکے کا نصف یا دو تہائی نہیں، بلکہ باقی ورثا کے حصے ادا کرنے کے بعد اولاد کے لیے بچ جانے والے ترکے کا نصف یا دو تہائی ہے۔ مصنف کے نزدیک یہاں 'فَاِنۡ كُنَّ نِسَآءً' میں حرف فاء کی دلالت بہت اہم ہے جسے جمہور اہل علم نے نظر انداز کیا ہے اور جو واضح طور پر بتاتی ہے کہ صرف بیٹیاں ہونے کی صورت 'لِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ' کی صورت پر ہی متفرع ہے اور اسی اصول پر ترکے کی تقسیم کا تقاضا کر رہی ہے جس پر بیٹوں اور بیٹیوں، دونوں کی موجودگی میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

اس اختلاف پر ایک بہت اہم نتیجہ عول کے مسئلے کے حوالے سے مرتب ہوتا ہے۔ جمہور کی تفسیر کی رو سے چونکہ بعض صورتوں میں بیٹیوں کو باقی ورثا کے ساتھ پورے ترکے میں سے حصہ دلوانے کے نتیجے میں ترکہ کم پڑ جاتا ہے اور تمام حصہ داروں کو ان کا حصہ پورا ادا کرنا ممکن نہیں ہوتا، اس لیے سب کے حصوں میں ان کے حصوں کے تناسب سے کمی کر دی جاتی ہے جسے فقہی اصطلاح میں 'عول' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص فوت ہو جائے اور اس کے ماں باپ، بیوی اور دو بیٹیاں وارث بن رہی ہوں تو بیٹیوں کو دو تہائی اور ماں باپ کو مشترکہ طور پر ایک تہائی دینے کے بعد بیوی کو آٹھواں حصہ دینے کے لیے ترکہ باقی نہیں بچتا۔ اسی طرح اگر عورت وفات پا جائے اور اس کے ماں باپ، شوہر اور دو بیٹیاں وارث بن رہی ہوں تو بیٹیوں کو دو تہائی اور ماں باپ کو ایک تہائی دینے کے بعد شوہر کو ایک چوتھائی دینے کے لیے ترکے میں گنجایش نہیں رہتی۔ جمہور فقہا ایسی تمام صورتوں میں یہ تجویز کرتے ہیں کہ سارے ورثا کے حصوں میں اس طرح متناسب کمی کر دی

جائے کہ کسی کو بھی اپنا مقررہ حصہ اگرچہ پورا نہ ملے، لیکن کوئی بھی محروم نہ رہے اور سب ایک تخفیف شدہ حصے کے حق دار بن جائیں۔اس کے بر خلاف مصنف کی راے کے مطابق چونکہ بیٹیوں کو دو تہائی پورے ترکے میں سے نہیں، بلکہ ماں باپ اور بیوی یا شوہر کے حصے ادا کرنے کے بعد باقی ترکے میں سے دیا جانا مقصود ہے، اس لیے کسی بھی صورت میں عول کی ضرورت پیش نہیں آتی۔(جمہور کی راے کے مطابق عول کی بعض صورتوں کا تعلق آیت ۱۲ میں بیان کی گئی کلالہ کی وراثت سے ہے۔ وہاں بھی، جیسا کہ آگے بیان کیا جائے گا، مصنف نے حکم کی جو تفہیم بیان کی ہے،اس کے مطابق عول کی ضرورت پیش نہیں آتی)۔

روایات کے مطابق عول کا طریقہ اس طرح کی بعض صورتیں سامنے آنے پر سیدنا عمر نے بعض دیگر صحابہ کے مشورے پر اختیار کیا تھا اور پھر اسی پر علما وفقہا کا عمومی اتفاق ہو گیا۔تاہم صحابہ میں سے عبد اللہ بن عباس کے متعلق منقول ہے کہ انھوں نے سیدنا عمر کی وفات کے بعد ان کے اس فیصلے سے اختلاف کیا اور کہا کہ اس کا مطلب تو یہ بنتا ہے کہ وہ ہستی جو ساحل سمندر پر ریت کے ذروں کی تعداد کو جانتی ہے، ترکے میں حصے مقرر کرتے ہوئے یہ اندازہ نہیں کر سکی کہ بعض صورتوں میں ان کی بہ یک وقت مکمل ادائیگی ممکن نہیں ہو گی (سنن سعید بن منصور، رقم ۳۶)۔ابن عباس نے اس صورت حال کا حل یہ بتایا کہ سب حصہ داروں کو پورے ترکے میں سے حصہ دینے کے بجائے ان کی اس طرح درجہ بندی کی جائے کہ جو وارث، مثلاً ماں باپ اور میاں بیوی ہر حال میں متعین حصے کے حق دار ٹھیرائے گئے ہیں، انھیں پورے ترکے میں سے حصہ دیا جائے، جب کہ جن وارثوں، مثلاً بیٹیوں اور بہنوں کو بعض صورتوں میں متعین حصے دیے گئے اور بعض میں باقی ماندہ ترکے میں حصہ دار بنایا گیا ہے،ان کا حصہ پہلی قسم کے وارثوں کو حصہ ادا کرنے کے بعد باقی مال میں سے ادا کیا جائے۔

ابن عباس کے اس موقف سے بعض اکابر تابعین، مثلاً محمد بن الحنفیہ، علی بن الحسین، امام محمد باقر اور عطاء کا اتفاق کرنا منقول ہے (سرخسی، المبسوط ۲۹/ ۱۶۱۔ الجوینی، نہایۃ المطلب فی درایۃ المذہب ۹/ ۱۳۸)، جب کہ امام زہری سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا کہ ابن عباس سے پہلے سیدنا عمر جیسے ایک عادل اور متقی امام نے ایک طریقہ جاری نہ کر دیا ہوتا تو باعتبار دلیل ابن عباس کی راے اتنی مضبوط تھی کہ اہل علم میں سے کوئی دو بھی ان سے اختلاف نہ کرتے (بیہقی، السنن الکبریٰ، رقم ۱۲۴۵۷)۔ بعد کے فقہا میں سے امام ابن حزم نے بھی عبد اللہ بن عباس کے موقف کی تائید کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ سیدنا عمر نے جو راے اختیار کی، روایات کی روشنی میں وہ ان کی کوئی باقاعدہ علمی راے نہیں تھی، یعنی انھوں نے اسے اس بنیاد پر اختیار نہیں کیا تھا کہ ان کے فہم کے

مطابق اللہ تعالیٰ کی منشا اس صورت میں اسی طرح ترکہ تقسیم کرانا ہے، بلکہ انھوں نے اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے یہ کہہ کر عول کا طریقہ اختیار کیا کہ یا اللہ، میں اس مسئلے کی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہوں، لیکن اس کے علاوہ کوئی اور حل سمجھ میں نہیں آ رہا، اس لیے اس کو اختیار کر رہا ہوں۔ ابن حزم کا کہنا ہے کہ اگر سیدنا عمر کے سامنے دلیل پر مبنی متبادل رائے آتی تو وہ عول کے طریقے کو ترک کر دیتے۔ اہل سنت کے فقہا کے علاوہ فقہاے امامیہ نے بھی سیدنا عمر کے طریقے کو قابل اعتراض قرار دیا اور اس کے مقابلے میں ابن عباس کے موقف کو راجح قرار دیا ہے (المحلیٰ ۹/ ۲۶۴-۲۶۵)۔

بہر حال جمہور فقہا نے صحابہ کے عمومی اتفاق اور امت کے تعامل کے پیش نظر ابن عباس کے موقف کو شاذ قرار دیا ہے اور اس پر یہ فقہی و قیاسی اعتراض بھی وارد کیا ہے کہ جب بیٹیوں، ماں باپ اور میاں بیوی کے حصے بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان میں کوئی تقدیم و تاخیر بیان نہیں کی اور ابن عباس قیاساً ماں باپ اور میاں بیوی کو مقدم اور بیٹیوں کو موخر کرنا چاہتے ہیں تو از روے قیاس اس سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ورثا میں تقدیم و تاخیر کرنے کے بجاے سب کو یکساں حصہ دار قرار دیا جائے اور بعض کو پورا، جب کہ بعض کو کم حصہ دینے کے بجاے سب کے حصوں میں یکساں کمی کر دی جائے تاکہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔

جمہور کے اس استدلال میں، جیسا کہ دیکھا جا سکتا ہے، قیاس کی حد تک کافی وزن ہے، لیکن جمہور کی طرف سے ابن عباس کے اس اصولی اعتراض کا کوئی جواب نہیں دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اس طرح کی تقسیم بنیادی طور پر کر ہی کیسے سکتے ہیں جس میں ورثا کو بیان کیے گئے حصے دینا ممکن نہ ہو؟ گویا اس طریقے پر بہت مضبوط عقلی اعتراض کا وارد ہونا ہی ابن عباس کے نزدیک یہ سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ سب وارثوں کو پورے ترکے میں سے حصہ نہیں دلوانا چاہتے۔ تاہم ان میں سے کس کو پورے ترکے میں سے اور کس کو باقی ترکے میں سے حصہ دلوایا جائے، اس کے جواب میں چونکہ ابن عباس کے پاس بظاہر ایک قیاسی استدلال ہے، اس لیے جمہور فقہا اس کے مقابلے میں صحابہ کے عمومی اتفاق کو زیادہ مضبوط سمجھتے ہیں جس کی تائید اسی نوعیت کے ایک مقابل قیاس سے بھی ہوتی ہے۔ مصنف نے اس موقف کے حق میں جو استدلال کیا ہے، اس سے بظاہر وہ کمزوری دور ہو جاتی ہے جو ابن عباس سے منقول موقف میں پائی جاتی ہے۔

[باقی]

ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

کائنات کا آغاز وارتقا: قرآنی بیانات اور سائنسی حقائق کے درمیان تطبیق کی راہ

(۲)

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سائنس اور مذہب میں تصادم

تاہم کائنات کی تخلیق کا مسئلہ تخلیق پسندوں اور سائنس دانوں کے مابین تصادم کا ذریعہ بن گیا ہے۔ تخلیق پسند کہتے ہیں کہ چونکہ فزکس کے قوانین ٹائم اینڈ اسپیس کے پابند ہیں، لہٰذا نقطۂ وحدانیت میں بگ بینگ کا سبب یا تو ان قوانین سے بالاتر کوئی محرک ہو گا یا کسی مافوق الفطرت ایجنسی نے اس کو انجام دیا ہو گا۔ جو ظاہر ہے کہ خدا کے سوا اور کوئی نہیں۔ ملحدین کہتے کہ خالق عالم یا کسی سپر نیچرل ایجنسی کو مان لینے سے مسئلہ حل نہیں ہو جاتا، تخلیق پسندوں کو جواب دینا ہو گا کہ کائنات کیسے وجود میں آئی۔ پال ڈیویز نے ان کی ترجمانی یوں کی ہے:

"A God who is invoked only to explain the big bang fails in all three criteria. Far from simplifying our view of the world a Creator introduces an additional complicating feature, itself without explanation. Second there is no way we can test the hypothesis experimentally. There is only one place where such a

God is manifested -namely the big bang, and that is over and done with. Finally the bold statement "God created the Universe" fails to provide any real explanation unless it is accompanied by a detailed mechanism. One wants to know, for example, without properties to assign this God. and precisely how he goes about creating the Universe, why the universe has the form it does, and so on. In short unless either you can provide evidence in some other way that such a God exists, or else give a detailed account of how he made the universe that even an atheist like me would regard as deeper, simple and more satisfying, I see no reason to believe in such a being."[۲۲]

”ایک خدا جس کا نام صرف بگ بینگ کی وضاحت کرنے کے لیے لیا جاتا ہے، وہ تینوں معیاروں پر پورا اترنے میں ناکام ہے۔ کائنات میں جو زبردست پیچیدگی ہے، اس میں خدا کو مان لینے سے اس میں صرف اضافہ ہی ہوتا ہے، کوئی حل نہیں ملتا۔ دوسری بات، ایسا کوئی طریقہ نہیں کہ ہم تجربے سے خدا کے مفروضے کی جانچ کر سکتے ہوں۔ یہاں صرف ایک ہی جگہ ہے جہاں ایسا خدا ظاہر ہوتا ہے اور وہ ہے بگ بینگ، جو ظاہر ہے کہ ہو چکا اور اب ختم۔ آخر میں یہ زبردست بیان کہ ”خدا نے کائنات کو تخلیق کیا“ اس وقت تک کوئی حقیقی وضاحت فراہم کرنے میں ناکام رہتا ہے جب تک کہ یہ ایک تفصیلی طریقۂ کار سے ہم آہنگ نہ ہو۔ ہر کوئی جاننا چاہتا ہے، مثال کے طور پر، اس خدا کو تفویض کی جانی والی خصوصیات کے بغیر، اور ممکنہ طور پر یہ کہ خدا کائنات کی تخلیق کیسے کرتا ہے اور کیوں، اور کائنات جس فارم میں ہے، اس میں کیوں ہے، وغیرہ۔ مختصر یہ کہ جب تک آپ اس بارے میں ایک مفصل احوال نہیں دے سکتے ہیں کہ اس نے کائنات کو کیسے بنایا کہ مجھ جیسا ایک ملحد بھی اس کو گہرا، سادہ اور زیادہ اطمینان بخش سمجھ سکے۔ مجھے اس طرح کے وجود پر یقین کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی ہے۔“

اس بحث میں بعض سائنس دانوں کی طرف سے اہل مذہب پر تیز و تند حملے کیے گئے۔ چنانچہ کارل ساگان لکھتا ہے:

"How is that hardly any major religion has looked at science

۲۲۔ بحوالہ جمشید اختر، The mind of God ۱۰۔

and concluded, this is better than we thought, the universe is much bigger than our prophets said grander, more subtle, more elegant?

In stead they say, no, no, no my God is a little God, and I want him to stay that way A religion old or now, that stressed the magnificence of the universe as revealed by modern science might be able to draw forth reserves of reverence and ave hardly tapped the conventional faith."[۲۳]

”ایسا کیوں ہے کہ کسی بڑے مذہب کے نبی نے شاید ہی کائنات کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا ہو کہ یہ ہمارے خیالات سے کہیں زیادہ بہتر، کہیں زیادہ وسیع اور کہیں زیادہ نازک وپر اسرار، خوش نما اور خوب صورت ہے۔

اس کے برخلاف وہ کہیں گے کہ نہیں نہیں! میرا خدا تو چھوٹا سا ہی خدا ہے اور میں جانتا ہوں کہ وہ ایسا ہی رہے گا۔ مذہب قدیم ہو یا جدید، سائنس سے عیاں ہورہی اس کائنات کی شان وشوکت اور جاہ وعظمت کو اگر اہمیت دے گا تو اس محفوظ ذخیرۂ احترام ورعب وجلال کا حق دار بن سکے گا جسے رواجی مذہب نے بمشکل ہی قابل اعتنا سمجھا ہے۔“ (کارل ساگان کے مضمون "Pol Blu Dot" کا ایک اقتباس جس کو رچرڈ ڈاکن نے اپنی کتاب "The God Delusion" میں نقل کیا ہے، اقتباس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر محمد زکی کرمانی کا ہے)

اہل تخلیق جو چند بڑے بڑے اعتراضات اہل سائنس پر کرتے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جتنی complexity اس میں اور جتنا بھر پور نظم Intelligent design پایا جاتا ہے، وہ بغیر کسی ذہین وجود کی مداخلت کے نہیں ہو سکتا۔

۲۔ فوسل رکارڈز میں عبوری صورتیں موجود نہیں، حالاں کہ زندہ اشیا اگر سادہ سے پیچیدہ کی طرف گئی ہیں تو تبدیلی کے مراحل کی یادہ شکلیں جن کا تغیر ابھی پورا نہیں ہوا، موجود ہونی چاہییں۔

۳۔ Cambrian age میں یکایک بڑے بڑے جانوروں کا ظہور ہوا۔

۴۔ آثاری اعضا، مثلاً اپنڈکس، عقل ڈاڑھ Pioned gland (صنوبری غدہ) وغیرہ کو کہا جاتا ہے کہ یہ انسان کے عبوری دور کے باقیات ہیں اور اب ان کا کوئی کام نہیں، مگر جدید میڈیکل سائنس یہ بتاتی ہے کہ کوئی بھی عضو بے کار نہیں ہے۔

۲۳۔ بحوالہ جمشید اختر، The mind of God، ۱۳۔

www.javedahmadghamidi.com

اہل ارتقا ان کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں[24]:

''وہ تسلیم کرتے ہیں کہ زندگی کا ظہور ایک بڑا ہی دل چسپ معمہ ہے جس کا حل ابھی تک پیش نہیں ہو سکا ہے۔ سائنس دان اس معمہ پر کام کر رہے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ ہم جلد ہی اس کو حل کر لیں گے۔ تھر موڈائنامکس کے دوسرے قانون کی بنیاد پر جو دلیل دی گئی ہے (یعنی انٹیلجنٹ ڈیزائن کی) اُس کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ دراصل closed system کے لیے ہے، ہمارے پیش نظر حیاتیاتی نظام closed نہیں ہے۔ فوسل رکارڈز کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ فوسل بننے کے لیے ضروری شرائط شاذ و نادر ہی پوری ہو پاتی ہیں، اِس لیے ممکن ہے کہ یہ پہیلی کبھی حل نہ ہو سکے، دراں حالیکہ ایسے متعدد فوسل دریافت ہو چکے ہیں جو ارتقائی تبدیلی کی وضاحت کرتے ہیں۔''[25]

بہر حال یہ دل چسپ بحث اہل سائنس اور اہل مذہب میں پوری شدت سے جاری ہے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ کائنات کی تخلیق، زمین کی تخلیق اور زمین پر زندگی کی نشو و نما سے متعلق قرآن میں کیا اشارات ملتے ہیں۔

علما کا موقف

اس موضوع پر مزید آگے بڑھنے سے پہلے اس طرف اشارہ کرنا مناسب ہو گا کہ کائناتی حقائق اور مذہب کے بارے میں علما اور خاص کر برصغیر کے علما کے اصولی مواقف کیا رہے ہیں۔

اس ضمن میں علما کا ایک عام موقف تو سائنس کو مسترد کرنے کا رہا ہے، جس کی مثال میں عالم عرب میں شیخ عبد العزیز بن باز کی کتاب ''الادلۃ النقلیۃ والحسیۃ علی دوران الشمس وسکون الارض'' اور ہند میں مولانا احمد رضا خان کی کتاب ''نزول آیاتِ فرقان بہ سکونِ زمین و آسمان'' کا ذکر کافی ہو گا۔

اگرچہ شیخ ندیم الجسر اور شیخ محمد عبدہ وغیرہ کا استثنا بھی ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور عمومی موقف یہ سامنے آیا کہ صحیح عقل اور صحیح نقل میں تعارض نہیں ہوتا۔ ماضی میں ابن تیمیہ کی کتاب ''درء تعارض العقل والنقل'' اسی کی نمایندہ ہے۔ اور اگر دونوں میں تعارض پایا جاتا ہے تو نقل کو فی الجملہ عقل پر ترجیح دی جائے گی۔ حال میں مولانا تھانوی اس رجحان کی نمایندگی کرتے ہیں[26]۔ جدید علما میں ایک اور نقطۂ نظر غلام احمد پرویز نے یہ پیش کیا کہ

۲۴۔ قرآن کریم اور ارتقائے حیات کی جستجو، جمشید اختر ۱۶۷، ایویریزا کیڈمی، علی گڑھ۔

۲۵۔ قرآن کریم اور ارتقائے حیات کی جستجو، جمشید اختر ۱۶۷، ایویریزا کیڈمی، علی گڑھ۔

۲۶۔ الانتباھات المفیدۃ فی حل الاشتباھات الجدیدۃ ۴۳-۴۷۔

مذہبی متن کثیر المعنی ہوتا ہے، اس کے لغت میں زمانے کے ساتھ چلنے کی گنجایش ہوتی ہے، اگرچہ متبادر معنی چھوڑنا پڑے"[27]۔

سر سید احمد خان یہ کہتے ہیں کہ متن کے معنی میں ارتقا ہوتا ہے اور یوں وہ زمانے کا ساتھ دینے کے قابل ہوتا ہے۔ اس میں بھی متبادر معنی چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ ان کی اصول التفسیر اور تفسیر میں اس رنگ کو دیکھا جا سکتا ہے"[28]۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی اپروچ تھوڑی فلسفیانہ ہے اور اس کا مآل یہ ہے کہ مذہب، کائنات یا تمدن کے باب میں جو کچھ بھی کہتا ہے، وہ دراصل اپنے مخاطبین کے عہد سے مربوط ہوتا ہے، لہٰذا متن کا مدلول ہر دور کے لحاظ سے بدل سکتا ہے"[29]۔

علما نے عام طور پر ان سبھی اپروچوں کو رد کر دیا ہے اور مولانا تھانوی والی اپروچ پر قائم ہیں۔ ایک اور موقف علامہ انور شاہ کشمیری نے پیش کیا، جس کو مزید شرح و وضاحت کے ساتھ استاذ جاوید احمد غامدی نے موکد و مبرہن کر کے پیش کیا ہے کہ سائنسی حقائق قرآن کا موضوع نہیں، لہٰذا کائناتی حقائق کے بارے میں سائنسی تحقیقات کو قبول کیا جائے گا۔ مولانا کشمیری نے لکھا ہے:

القرآن قد يعتبر الواقع بحسب الحس أيضا كما أنه يعتبر الواقع بحسب نفس الأمر، فيدير الأحكام على ما هو المشهود من هذ الباب قوله "والشمس تجرى لمستقر لها" فإن جريانها مشاهد سواء كانت جارية فى الواقع بحسب نفس الأمر أولا. وهو الذي يناسب شأن القرآن، فإنه لو بنى كلامه على نفس الأمر الواقع في كل موضع لما

"قرآن کبھی واقع کو مشاہدہ کے مطابق اعتبار کر لیتا ہے اور کبھی نفس الامر کے مطابق یوں وہ انسان کے مشاہدہ کی بنیاد پر احکام کو مبنی کر دیتا ہے، چاہے حقیقت نفس الامری کچھ اور ہو، مثلاً فرمایا: "اور سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جا رہا ہے" تو یہاں سورج کا چلنا مشاہد ہے، حالاں کہ یہ ضروری نہیں کہ مشاہدہ حقیقت کے مطابق بھی ہو۔ قرآن کے لیے یہی مناسب اسلوب تھا، کیونکہ اگر وہ ہر چیز میں حقیقت نفس الامری کو

۲۷۔ مفہوم القرآن ۲۴۔

۲۸۔ التحریر فی اصول التفسیر ۷۔

۲۹۔ اسلام: اردو ترجمہ محمد کاظم ۵-۴۷۔

آمن به كثير من البشر، فإن من فطرته الجمود على تحقيقه.[30]

ہی سامنے رکھتا تو بہت سے لوگ اس پر ایمان ہی نہ لاتے، کیونکہ انسان اپنی تحقیق پر طبعاً جمود اختیار کرلیتا ہے۔‘‘

ظاہر ہے کہ یہاں شاہ صاحب کا موقف یہ ہے کہ قرآن کریم کائناتی مظاہر سے متعلق جو بیانات دیتا ہے، ان کا مقصود حقیقت نفس الامری کا بیان نہیں، بلکہ ان کا مقصد اخلاقی ہے اور یہ اسلوب بیان مخاطبین اولین کی فہم کا لحاظ رکھنے والا اسلوب ہے۔ ہمارے نزدیک مولانا کشمیری کا موقف ہی زیادہ مناسب اور علمی ہے۔

کائنات کی تخلیق کی مدت

قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک یوم کبھی ہمارے ہزار دن کے برابر ہوتا ہے: ’وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ‘ (الحج ۲۲: ۴۷) اور کبھی پچاس ہزار سال کے برابر ’تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ‘ (المعارج ۷۰: ۴)۔

اصل میں یوم (دن، day) ہماری زمینی اصطلاح میں اس مدت کا نام ہے جس میں زمین اپنے محور پر ایک چکر مکمل کرتی ہے جو چوبیس گھنٹے میں پورا ہوتا ہے، اسی سے دن اور رات بنتے ہیں۔ ’’لسان العرب‘‘ میں ہے:

يوم: اليوم معروف مقداره من طلوع الشمس إلى غروبها والجمع أيام.[31]

خود ہمارے نظام شمسی میں مختلف سیاروں کے دن کا عرصہ مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً مرکری کے تین دن اس کے دو سال کے برابر ہیں، یعنی ڈیڑھ دن کا ایک سال ہے، وغیرہ۔ تو قرآن میں تخلیق کائنات کے چھ دن جو بیان ہوئے ہیں، ان سے مراد ہمارا زمین کا دن نہیں، بلکہ مرحلہ یا Phase ہے، کیونکہ اس وقت نہ نظام شمسی وجود میں آیا تھا، نہ زمین، تو قرآن میں بیان کردہ ایام دراصل مختلف فیز ہیں جو چھوٹے اور بڑے ہو سکتے ہیں۔ تو جب یہ فرمایا کہ ’اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۢ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ‘، ’’تمھارا رب وہ ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ

۳۰۔ فیض الباری علی صحیح البخاری، دار الکتب العربیۃ، بیروت ۴/ ۳۰۶۔

۳۱۔ ۱۶/ ۱۳۷۔ بحوالہ مقالات سرسید ۴/ ۷۳۔

دنوں میں پھر عرش پر مستوی ہوا، وہ رات کو دن پر ڈھانپتا ہے جو جلد جلد دن کا پیچھا کرتی ہے اور سورج اور چاند اور ستارے سب اس کے ہاتھ میں مسخر ہیں، آگاہ رہو اسی کے لیے ہے خلق اور امر، پس بابرکت ہوا جو تمام جہان والوں کا رب ہے'' (الاعراف ۷: ۵۴)، تو اس سے مراد ہماری زمین کے مروجہ ایام نہیں ہو سکتے۔

تخلیق کے چھ ادوار

بائیبل میں تخلیق کائنات کا چھ دن میں ہونا بتایا گیا اور کہا گیا ہے کہ اس کے بعد ایک دن کا آرام، یعنی یوم سبت ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں میں یوم سبت منانے کا رجحان اسی سے پیدا ہوا کہ خداوند نے ہفتہ کے چھ دن محنت کرنے کے بعد آرام کیا[۳۲]۔

سینٹ آگسٹائن نے بائیبل کی کتاب پیدایش (Book of Genesis) کے کائنات کی تخلیق کی تاریخ پانچ ہزار قبل مسیح تسلیم کی۔ (دل چسپ بات یہ ہے کہ تاریخ بھی دس ہزار قبل مسیح کے آخری برفانی دور کے اختتام سے زیادہ دور کی تاریخ نہیں ہے۔ جب ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق تہذیب کی اصل ابتدا ہوئی تھی''۔[۳۳] یہاں یوم سے مراد ایک دور ہی ہو سکتا ہے۔ چونکہ قدیم مفسرین کو جدید کاسمولوجی کا کوئی علم نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا، تو وہ اس میں معذور تھے کہ 'فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ' سے مراد دن ہی لیں۔ (مثال کے طور پر دیکھیں: تفسیر ابوالسعود، قرطبی اور دوسری قدیم تفاسیر)۔ لیکن کئی جدید مفسرین ومترجمین، مثال کے طور پر عبد اللہ یوسف علی غیرہ تخلیق کائنات کے ضمن میں آنے والی ہر آیت میں یوم سے مراد طویل وقفہ یا قرن لیتے ہیں[۳۴]۔

'وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ'، ''ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے مابین ساری چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا کر دیا اور ہمیں کوئی تھکان لاحق نہیں ہوئی'' (ق ۵۰: ۳۸)۔ یہاں یہ بات نوٹ کی جاسکتی ہے کہ جدید کاسمولوجی ـــــ جو زمین کو ایک ذرۂ ناچیز قرار دیتی ہے ـــــ کے برعکس قرآن زمین کو اہمیت دیتا ہے اور بار بار اہتمام سے 'سَمَاوَات' (کائناتوں) کے ساتھ اس کا تذکرہ کرتا ہے۔ موریس بوکایئے کہتے ہیں کہ ''آسمانوں کے ماورا اور زمین سے باہر یہ تخلیق جس کا کئی

۳۲۔ بائبل قرآن اینڈ سائنس، موریس بوکایئے ۲۰۸۔

۳۳۔ وقت کا سفر ۲۶۔

۳۴۔ بائبل قرآن اینڈ سائنس، موریس بوکایئے ۲۱۰۔

مرتبہ ذکر آیا ہے (آیات ۴۸، ۸۷، ۸۸۔ ۴۴ : ۷۔ ۱۶ : ۲۱ وغیرہ)، وہ چیز ہے جس کا تصور مشکل ہے اور ان آیات کو سمجھنے کے لیے کائنات کے ماورا کہکشانی مادہ کے بارے میں انسان کے جدید ترین مشاہدات و تجربات کا حوالہ دینا پڑے گا''[۳۵] یہ 'مَا بَیْنَ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ' جدید سائنسی تحقیقات کے مطابق ایسا گیسی مادہ تھا جو ہائیڈروجن اور ہیلیم کی کچھ مقدار سے مرکب تھا اور آہستہ آہستہ گردش کر رہا تھا جس کو قرآن میں 'دُخَانٌ' سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ گیسی مادہ زبردست اور اتھاہ ذخیرہ (سدیم) غالباً وہی ہے جس کو اِس آیت میں بتایا گیا ہے: 'اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا' (مادہ کی یہ بہت بڑی مقدار سائنس دانوں کے مطابق موجودہ سورج کے ایک ارب سے لے کر ایک کھرب گنا زیادہ تھی اور مرکب (رتق) تھی۔ جب (حکم خداوندی) سے اس مرکب مادہ میں انشقاق (فتق) ہوا تو اُس زبردست گیسی مادہ کے فتق اور ٹوٹ پھوٹ سے اس مادہ کے ٹکڑے ٹکڑے بگ بینگ کے ذریعے سے دور دور بکھرے اور خلا لانہایت تک پھیلتی چلی گئی اور جو ابھی تک مزید پھیلتی جارہی ہے اور 'وَاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ' کا منظر نامہ پیش کر رہی ہے۔ اور اسی بکھرے مادہ سے عظیم الجثہ کہکشانیں و کائناتیں (سَمَاوَات) سیارے ستارے اور دم دار تارے اور سپر نووا وغیرہ اسپیس میں پیدا ہو گئے۔ اس کے بعد ٹائم کے تصور کا ظہور ہوا۔

بہ ظاہر سورۂ حٰم السجدہ کی ان چار آیتوں میں جن میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق، زمین پر پہاڑوں کے جمانے کا بیان ہوا ہے، تخلیق کے واسطے چھ ادوار اور کہیں دو ادوار کے بیان میں ایک تضاد دکھائی دیتا ہے جس کو امام رازی اس طرح دور کرتے ہیں:

''یہاں چند سوالات ہیں۔ پہلا سوال خدا نے بیان کیا کہ اس نے دنیا کو دو دنوں میں پیدا کیا اور یہ کہ ان تینوں قسموں کو دوسرے چار دنوں میں پیدا کیا اور یہ کہ اس نے آسمانوں کو دو دن میں پیدا کیا تو اس کا مجموعہ آٹھ دن ہوئے، لیکن خود خدا نے اور آیتوں میں یہ بیان کیا ہے کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ اس سے تناقض لازم آتا ہے۔ جاننا چاہیے کہ علما نے اس کا اس طرح جواب دیا ہے کہ مراد خدا کے اس قول سے ''وقدر فیھا اقواتھا فی اربعة ایام'' یہ ہے پہلے دو دنوں کے ساتھ ملا کر اور اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے قائل کہے کہ میں بصرہ سے بغداد گیا دس دن میں اور کوفہ کو پندرہ دن میں تو مطلب یہ ہوگا کہ دونوں کی مسافت کو ملا کر اور ایک شخص دوسرے سے کہتا ہے کہ میں نے تجھ کو ایک ہزار ایک مہینے میں دیے اور کئی

۳۵۔ بائبل قرآن اینڈ سائنس، موریس بوکائیے ۲۱۰۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ہزار دو مہینوں میں تو وہ ہزار بھی انھی ہزاروں میں داخل ہو گا اور وہ مہینا دونوں مہینوں میں۔''[36]

مفسر قرآن جاوید احمد غامدی کی تشریح کے مطابق دنیوی زندگی عارضی ہے، مگر وہ موت سے ختم نہیں ہوتی، بلکہ برزخ کے وقفہ کے بعد انسان حیات ابدی میں داخل کر دیا جائے گا۔ جنت کی وسعتوں اور درجوں کے بارے میں جو معلومات قرآن وحدیث میں آئی ہیں، وہ زمین وآسمانوں کو ختم کر کے ایک نئی دنیا اور نئی کائنات میں بدل کر اہل جنت کو بڑے بڑے باغات اور قصور فاخرہ دیے جائیں گے، وہ دراصل موجودہ کائناتوں کے ملبہ سے تیار کر دیے جائیں گے[37]۔

اس ضمن میں قرآن ایسے منتخب الفاظ استعمال کرتا ہے جن کی تفسیر وتشریح قدیم زمانے میں اس وقت کی کاسمولوجی کے مطابق کی جاتی تھی اور ان میں یہ وسعت ہے کہ ان کی نئی سائنسی تشریح بھی کی جاسکتی ہے۔ وہ ہیں:

☆بایدیه ید: بمعنی ہاتھ، قوت، توانائی کے معنی میں ہے: پرانے مترجمین ومفسرین اس سے مراد لیتے تھے کہ ہم نے اپنی طاقت وقوت کے ذریعے سے کائنات کو پیدا کیا۔ آج کا مفسر کہہ سکتا ہے کہ ہم نے توانائی کے ذریعے سے کائنات کی تخلیق کی۔

☆رتق: کسی شے کو باندھنا اور ملانا، ابتدائی کمیتی اکائی۔

☆فتق: توڑنا اور الگ کرنا، پھاڑنا۔

پرانے مترجمین اس آیت کا ترجمہ کیا کرتے تھے کہ پہلے آسمان وزمین ملے ہوئے اور یکجا تھے، پھر ہم نے ان کو پھاڑا اور جدا جدا کر دیا۔ آج اس کی سائنسی تشریح یوں کی جاسکتی ہے کہ آسمان و زمین سب ایک اکائی (singularity) یا کائناتی انڈا (Minute Cosmic Egg) یا ابتدائی ایٹم (Primal Atom) میں تھے، جس میں بے پناہ توانائی تھی۔ اور اس بے پناہ توانائی نے اس ابتدائی کمیتی اکائی کو ناقابل تصور حد تک کثیف اور گرم مقام بنا رکھا تھا۔ وہ انڈا خدا کے حکم سے اچانک پھٹا اور اس کے نتیجہ میں اِس کائنات کا مختلف الاقسام مادہ تخلیق پایا اور اس بکھرے مادے سے مختلف کہکشائیں اور کائناتیں تخلیق پائیں۔

☆دخان: دھواں، گیس نہایت چھوٹے ذرات پر مشتمل ایک گیسی مرغولہ کے وجود کا ذکر، اس لیے کہ

۳۶۔ تفسیر کبیر ۵/ ۴۹۹، بحوالہ مقالات سرسید ۴/ ۱۸، مرتب: مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع دوم، جنوری ۱۹۸۸ء۔

۳۷۔ یوٹیوب لیکچر۔

یہی وہ چیز ہے جس کے ذریعے سے لفظ 'دخان' کی توضیح وتشریح کی جاسکتی ہے۔ دھواں عموماً ایک گیس میں جمع کم وبیش مستحکم تطبیق کی حالت میں مہین ذرات ایسے مادہ کی ٹھوس اور رقیق حالتوں پر مشتمل ہوتے ہیں جن کا درجۂ حرارت زیادہ یا کم ہوتا ہے [۳۸]۔

☆فطر: بلا کسی نمونہ کے ابتداءً کسی چیز کو بنانا۔

☆فلق: پھاڑنا یہ 'فتق' کے ہم معنی بھی ہے اور اس کا سادہ مفہوم رات ودن کو الگ کرنا بھی ہے، جیسا کہ عام مترجمین کرتے ہیں۔ ترکی اسکالر ڈاکٹر ہلوک نور باقی نے علم اشتقاق کی رو سے لفظ 'فلق' کے متعدد معانی بیان کیے ہیں، تاہم اس لفظ کا بنیادی معنی کسی چیز کا اچانک پھٹنا اور شدید دھماکا کرنا ہے۔

[۳۹] تفلق: تیز رفتاری سے بھاگنے کو کہتے ہیں۔ (ایضاً) یہی معنی ہمارے موضوع کے لحاظ سے یہاں زیادہ مناسبت رکھتے ہیں۔

رتق یا ابتدائی کمیتی اکائی سے پہلے کائنات میں کیا تھا؟ اس کا جواب سائنس نہیں دیتی۔ بعض سائنس دان یہ کہتے ہیں کہ اس سوال کی کوئی اہمیت نہیں، کیونکہ یہ سائنس کا نہیں، فلسفہ کا سوال ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ اس بات کا امکان ہے کہ ہمیں اس کا پتا چل جائے کہ بگ بینگ سے پہلے کیا تھا؟ بعض نے کہا ہے کہ بگ بینگ سے پہلے یہ تمام خلا گیسوں کے زبردست بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ خود اسٹیفن ہاکنگ یہ کہتا ہے کہ ''کائنات کی ابتدائی صورت حال کا سوال بعض سائنس دانوں کے نزدیک مابعد الطبیعات یا مذہب کا معاملہ ہے''[۴۰]۔

مذہب اس سوال کو یوں حل کرلے گا کہ خدا نے جس وقت چاہا کائنات کو پیدا کر دیا اور اس کا طریقہ یہ اپنایا جو قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ:

اِذَا قَضٰٓی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ. (مریم ۱۹: ۳۵)	''جب وہ کسی کام کا فیصلہ فرماتا ہے تو اُسے صرف یہی حکم دیتا ہے کہ ''ہو جا'' پس وہ ہو جاتا ہے۔''

تخلیق کے بارے میں مولانا آزاد کی رائے

۱۔ آسمان وزمین کی پیدایش ایک ایسے مادہ سے ہوئی جسے قرآن 'دُخَانٌ' سے تعبیر کرتا ہے: 'ثُمَّ اسۡتَوٰٓی

۳۸۔ موریس بوکائیے ۲۱۵۔

۳۹۔ وقت کا سفر ۳۰۔

۴۰۔ قادری، تخلیق کائنات ۷۷۔

اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ‘(حٰم السجدہ ۴۱: ۱۱)، دخان کے معنی دھویں کے ہیں یا ایسی بھاپ کے جو اوپر چڑھی ہوئی ہو۔

۲۔ یہ مادہ دخانیہ ابتدا میں ملا ہوا تھا، الگ الگ نہ تھا۔ پھر اُس کے مختلف حصے ایک دوسرے سے جدا کر دیے گئے اور ان سے اجرام سماویہ کی پیدایش ظہور میں آئی: ’اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا‘ (الانبیاء ۲۱: ۳۰)۔

۳۔ یہ تمام کائنات بہ یک دفعہ ظہور میں نہیں آگئی، بلکہ تخلیق کے مختلف دور یکے بعد دیگرے طاری ہوئے۔ یہ دور چھ تھے، جیسا کہ آیت زیر بحث میں ہے۔

۴۔ سات ستاروں کی تکمیل دو ادوار میں ہوئی: ’فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ‘ (حٰم السجدہ ۴۱: ۱۲)۔

۵۔ زمین کی پیدایش دو ادوار میں ہوئی: ’قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ‘ (حٰم السجدہ ۴۱: ۹)۔

۶۔ زمین کی سطح کی درستی اور پہاڑوں کی نمود اور قوت نشو و نما کی تکمیل بھی دو ادوار میں ہوئی اور اس طرح یہ چار دور ہوئے: ’وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ‘ (حٰم السجدہ ۴۱: ۱۰)۔

۷۔ تمام اجسام حیہ، یعنی نباتات و حیوانات کی پیدایش پانی سے ہوئی: ’وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ‘ (الانبیاء ۲۱: ۳۰)۔

۸۔ انسان کے وجود پر بھی یکے بعد دیگرے مختلف حالتیں گزری ہیں: ’وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا‘ (نوح ۷۱: ۱۴)۔

ان تمام اشارات کا ماحصل بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں مادہ دخانی تھا، پھر اس میں انقسام ہوا، یعنی بہت سے ٹکڑے ہو گئے، پھر ہر ٹکڑے نے ایک کرہ کی شکل اختیار کر لی اور اُسی کے ایک ایک ٹکڑے سے زمین بنی۔ پھر زمین میں کوئی ایسی تبدیلی واقع ہوئی کہ دخانیت نے مائیت کی شکل اختیار کر لی، یعنی پانی پیدا ہو گیا۔ پھر خشکی کے قطعات درست ہوئے، پھر پہاڑوں کے سلسلے نمایاں ہوئے۔ پھر زندگی کا نمو شروع ہوا اور نباتات ظہور میں آ گئیں۔ موجودہ زمانے میں اجرام سماویہ کی ابتدائی تخلیق اور کرۂ ارض کی ابتدائی نشو و نما کے جو نظریے تسلیم کر لیے گئے ہیں، یہ اشارات بظاہر ان کی تائید کرتے ہیں اور اگر ہم چاہیں تو ان بنیادوں پر شرح و تفصیل کی بڑی بڑی عمارتیں اٹھا سکتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا صحیح نہ ہوگا۔... قرآن کا مقصود ان اشارات سے تخلیق

عالم کی شرح و تحقیق نہیں ہے خدا کی قدرت و حکمت کی طرف انسان کو توجہ دلانا ہے"[41]۔

بگ کرنچ یا عظیم تباہی اور نئی کائنات کا ظہور

جیسا کہ اوپر گزرا کہ کائنات کے آغاز و ارتقا کے بارے میں متعدد تھیوریوں اور نمونوں میں بگ بینگ کی تھیوری آرنو پینزیاس، رابرٹ ولسن اور ایڈون ہبل نے پیش کی اور اب تقریباً تمام سائنس دان اس پر متفق ہو چکے ہیں کہ کائنات کے آغاز سے متعلق اب تک کی سب سے بامعنی ممکنہ تھیوری یہی ہے جس سے تمام واقعات کی ممکنہ توجیہ کی جا سکتی ہے۔ مختلف نمونوں میں یہی زیادہ قابل قبول ثابت ہوا ہے۔ عبد الستار منہاجین اس کی مزید وضاحت کرتے ہیں: ''عظیم دھماکے کا نظریہ اس بات کو بھی لازم قرار دیتا ہے کہ کائنات کا اختتام ہو جب تمام تر مادۂ کائنات آپس میں ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا''[42]۔ یہ عظیم سانحہ آج سے تقریباً ۶۵ ارب سال بعد وقوع پذیر ہو گا۔ سائنس کے مطابق کائنات الٹی سمت میں بھاگ رہی ہے۔ تمام کائنات اور باقی مادہ ۱۸ ارب سال کے چکر میں اُس صفر سیکنڈ پر قریب قریب غالب آتے ہوئے جو ''کائناتی احتراق'' لمحہ ہے، اُسی لمحے کی طرف جا رہا ہے جہاں سے اس کائنات کی اولین تخلیق عمل میں آئی تھی۔

اسٹیفن ہاکنگ نے لکھا ہے:

> ''اگر کائنات پھیل رہی ہے تو اس کی کوئی طبیعی وجہ بھی ہو گی اور اس پھیلاؤ کی ابتدا بھی ضرور ہوئی ہو گی۔ کوئی چاہے تو یہ سوچ سکتا ہے کہ خدا نے کائنات کو بگ بینگ کے لمحے میں تخلیق کیا ہے۔ یا پھر اس کے بعد اس طرح بنایا ہو کہ ہمیں یہ تاثر ملے کہ اس کا آغاز بگ بینگ سے ہوا ہے۔ مگر یہ فرض کرنا تو بہر صورت بے معنی ہو گا کہ اسے بگ بینگ سے پہلے تخلیق کیا گیا تھا۔ پھیلی ہوئی کائنات خالق کو خارج از امکان قرار نہیں دیتی، مگر وہ یہ حدود ضرور مقرر کرتی ہے کہ یہ کائنات اس نے کب بنائی ہو گی۔''[43]

یہ اقتباس بتاتا ہے کہ یہ کتاب لکھتے وقت اسٹیفن ہاکنگ خدا کے وجود پر یقین رکھتا تھا۔ سائنس دان جان ویلز کا کہنا ہے کہ اگر کائنات بلیک ہول سے طبیعاتی قوانین کے مطابق متصادم ہو کر تباہ ہوئی تو نئی جیو میٹری کے

۴۱۔ ابو الکلام آزاد، تفسیر ترجمان القرآن، ۲/۲۳۱-۲۳۲، اسلامی اکادمی، لاہور۔

۴۲۔ وقت کا سفر ۳۰۔

۴۳۔ وقت کا سفر ۲۸۔

ساتھ اس کے دوبارہ وجود پذیر ہونے کے پورے امکانات موجود ہیں۔ سائنس کی زبان میں اس کو بگ کرنچ (Big Crunch) کہا جاتا ہے۔

یہ بگ کرنچ ایک اور نئے بگ بینگ کا باعث بن سکتی ہے، جس کے نتیجہ میں ناقابل اختتام کائناتی پھیلاؤ یا چکردار کائنات (Oscillating Universe) کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ کیا قرآن کی آیات میں ہم اس کو trace کر سکتے ہیں؟ ڈاکٹر طاہر القادری کا جواب اثبات میں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ 'يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ؕ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ'، ''اُس دن ہم (ساری) کائنات کو اس طرح لپیٹ دیں گے، جیسے لکھے ہوئے کاغذ کو لپیٹ دیا جاتا ہے، جس طرح ہم نے کائنات کو پہلی بار پیدا کیا تھا، ہم (اس کے ختم ہو جانے کے بعد) اُسی عمل تخلیق کو دہرائیں گے۔ یہ وعدہ پورا کرنا ہم نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ ہم یہ (اعادہ) ضرور کرنے والے ہیں'' (الانبیاء ۲۱: ۱۰۴)[۴۴]۔ کم از کم ایک آیت اور ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہم ان آسمان وزمین کو بدل کر دوسرے آسمان وزمین وجود پذیر کر دیں گے: 'يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ'، ''جس دن (یہ) زمین دوسری زمین سے بدل جائے گی اور جملہ آسمان بھی بدل جائیں گے اور سب لوگ اللہ کے روبرو حاضر ہوں گے جو سب پر غالب ہے'' (ابراہیم ۱۴: ۴۸)۔ اس سے یہ سائنسی حقائق ثابت ہوتے ہیں۔

اسٹیفن ہاکنگ بھی کائنات کے ممکنہ اختتام کو مانتے ہیں ایک جگہ اس نے لکھا:

''میں نے یہ بتایا کہ آئن اسٹائن کے عمومی نظریۂ اضافت کے مطابق کائنات کا آغاز ہونا ضروری ہے اور ممکنہ طور پر اس کا ایک انجام ہے۔''[۴۵]

[باقی]

۴۴۔ تخلیق کائنات، طاہر القادری ۱۵۳۔

۴۵۔ وقت کا سفر ۲۸۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سیر و سوانح

محمد وسیم اختر مفتی

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ

(۱)

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ابتدائی زندگی

حضرت سلمان فارسی کا اصل نام ماہویہ (مابہ یا روزبہ یا بہبود) بن بوذخشان (یا خشفوذان) بن دہ دیرہ (مورسلا یا آذر جشیش) تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس کی بیان کردہ مشہور روایت کے مطابق وہ اصفہان کے قصبہ جیّ (یا کازرون :Wikipedia) میں پیدا ہوئے۔ زید بن صوحان کی روایت میں خوزستان کے قریبی شہر رامہرمز کوان کی جاے پیدایش بتایا گیا ہے۔ خود حضرت سلمان فارسی سے بھی یہی مروی ہے (بخاری، رقم ۳۹۴۷)۔ ایک روایت کے مطابق رامہرمز میں ان کی ننھیال تھی، جب کہ والد بوذخشان کا تعلق اصفہان کے آب الملک کے خاندان سے تھا۔ وہ اپنے قصبے کے سردار تھے۔ انھیں اپنے بیٹے سے بہت لگاؤ تھا۔ شدت محبت سے اسے کنواری لڑکیوں کی طرح گھر میں بند کر رکھا تھا، یہاں تک کہ کھیتوں کی دیکھ بھال کے لیے نکلتے تو یہ تاکید کر جاتے کہ بیٹا باہر نہ جائے۔ دو غلام ان کی خدمت کے لیے مختص تھے۔ حضرت سلمان مجوسی آتش پرستوں کے زرتشتی مذہب پر شدت سے عمل پیرا تھے، اپنے گھر کے آتش کدے میں اپنے باپ کی جلائی ہوئی آگ کے پاس بیٹھے رہتے اور اسے ایک گھڑی بھی بجھنے نہ دیتے۔ اس خدمت پر مامور شخص کو قطنِ کہا جاتا تھا، سولہ برس کی عمر میں وہ

اس منصب پر فائز ہوئے، یہی ان کی عبادت تھی۔

راہ حق کی پہلی جھلک

حضرت سلمان کے والد کی ملکیت میں ایک بڑا گاؤں اور اراضی تھی۔ایک دن وہ گھر کی تعمیر و مرمت کے کام میں مشغول تھے، انھوں نے کچھ کام حضرت سلمان کے سپرد کر کے کہا: تم گاؤں کے کام نمٹا آؤ، دیکھو لوٹنے میں دیر نہ کرنا، کیونکہ تمھارا پاس ہونا میرے لیے جایداد سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ والد کی ہدایت کے مطابق وہ گھر سے نکلے، آس پاس غور سے دیکھتے جا رہے تھے، کیونکہ انھیں باہر نکلنے کا موقع کم ہی ملتا تھا۔ راستے میں ان کا گزر عیسائیوں کے گرجا پر ہوا۔ اندر سے مدھر آوازیں ان کے کانوں میں پڑیں تو جھانک کر دیکھا کہ بہت سے لوگ مل کر بڑے جذبے سے اونچی آواز میں خدا کے گن گا رہے ہیں۔ حضرت سلمان اندر داخل ہو گئے، ان کی عبادت انھیں ایسی بھلی لگی کہ اسے دیکھنے میں منہمک ہو گئے، شام ہو گئی اور وہ اپنے والد کی اراضی پر بھی نہ جا سکے۔ انھوں نے سوچا کہ یہ دین ان کے مذہب سے کہیں بہتر ہے۔ لوٹنے سے پہلے پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے ان لوگوں سے پوچھا: آپ کے مذہب کا مرکز کہاں ہے؟ جواب ملا: ملک شام۔

شام کا اندھیرا چھا چکا تھا، بوذخشان اپنے بیٹے کے گھر نہ لوٹنے پر پریشان تھے، چاروں طرف آدمی دوڑا دیے تھے۔ حضرت سلمان واپس آئے تو خوب ناراض ہوئے، پھر ساتھ چمٹا لیا، خوشی کے آنسو ان کی آنکھوں سے رواں تھے۔ حضرت سلمان نے بتایا کہ میں نے گرجا میں عیسائیوں کو عبادت کرتے دیکھا ہے اور مجھے ان کا دین بھلا لگا ہے۔ ان کے والد نے کہا: بیٹا مذہب تو وہی سچا ہے جو ہمارا ہے۔ حضرت سلمان نے اصرار کیا: ابا، یہ ہرگز صحیح نہیں کہ ہم خدا کی عبادت میں کسی کو شریک کریں، میں تو اب آگ کی پوجا ہرگز نہیں کروں گا اور ایک ہی بن دیکھے خدا کے گن گاؤں گا۔ ان کی گفتگو سن کر بوذخشان فکر میں پڑ گئے کہ ماہویہ مذہب بدل کر عیسائی نہ ہو جائے۔ انھوں نے بیٹے کے پاؤں میں بیڑیاں ڈلوا دیں، اس طرح حضرت سلمان قید کی زندگی گزارنے لگے، مگر اپنے ایک وفادار ملازم کے ذریعے سے اہل کلیسا سے رابطہ رکھا۔ جوں ہی انھیں خبر ملی کہ شام سے عیسائی تاجروں کا ایک قافلہ اصفہان پہنچا ہے اور چند روز میں واپس ہو گا، انھوں نے شام جانے کی تیاری کی، بیڑیاں کٹوا کر چپکے سے گھر سے نکلے اور قافلے میں شامل ہو گئے۔ ماں باپ اور گھر سے دور ہو جانے کے باوجود وہ روحانی خوشی سے سرشار تھے۔ Wikipedia کے مضمون نگار نے اس وقت حضرت سلمان کی عمر انیس سال اور سن وقوع ۵۸۷ء بتایا ہے۔

شام، پہلی منزل

شام پہنچتے ہی حضرت سلمان نے لوگوں سے پوچھا کہ یہاں کا سب سے بڑا مذہبی پیشوا کون ہے؟ انھیں بتایا گیا کہ فلاں کنیسہ کا اسقف (لاٹ پادری) یہاں کی سب سے بڑی مذہبی شخصیت ہے۔ وہ فوراً اس کے پاس پہنچے اور کہا: میں آپ کے پاس رہ کر آپ کا دین سیکھنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ شب و روز گرجے میں رہ کر عبادت کرنے اور پادری کی خدمت کرنے لگے۔ چند روز ہی میں انھیں معلوم ہو گیا کہ یہ پادری بڑا مکار اور لالچی ہے، لوگ اس کے وعظ و نصیحت پر صدقہ و خیرات کرتے ہیں اور یہ مال غربا کو نہیں دیتا، بلکہ خود سینت سینت کر رکھتا ہے۔ حضرت سلمان یہ دیکھ دیکھ کر کڑھتے، مگر خدا کی عبادت میں کوئی کمی نہ کی۔ پادری کی زندگی کے دن پورے ہوئے تو دور دور سے اس کے عقیدت مند جمع ہوئے۔ لوگ غم سے مرجھائے ہوئے تھے، مگر حضرت سلمان غصہ سے بے قابو تھے۔ ان سے رہا نہ گیا، کہا: آپ اس شخص کی آخری رسومات ادا کرنے آئے ہیں جو دین کے پردے میں شیطان تھا۔ مسکینوں اور محتاجوں کے نام پر خیرات لیتا اور یہ سات مٹکے جمع کر لیے جو سونے اور چاندی سے لب ریز ہیں۔ حاضرین بھی آپے سے باہر ہو گئے اور انھوں نے پادری کا جنازہ پڑھنا تو کجا اس کی لاش کو سولی پر لٹکا کر اس پر پتھر برسائے۔

گرجا میں نئے اسقف کا تقرر ہوا جو پہلے کے برعکس انتہائی نیک اور خدا رسیدہ تھے، دن رات اللہ کی عبادت کرتے۔ دنیا سے بے رغبت ہو کر آخرت کی تیاری میں مشغول رہتے۔ حضرت سلمان کو ان کی طویل رفاقت میسر آئی۔ ان کا آخری وقت آیا تو حضرت سلمان نے عرض کیا: حضرت مجھے آپ سے بڑی محبت ہے، کیونکہ آپ نے مجھے دین سکھایا۔ مجھے وصیت کیجیے کہ اب کہاں جاؤں؟ فرمایا: دین مسیحی کے سچے پیرو کم ہی رہ گئے ہیں، اکثریت نے تحریفات کر کے بدعات ایجاد کر لی ہیں۔ شہر موصل میں اللہ کا ایک بندہ ہے جو ٹھیک اس دین پر قائم ہے جس پر ہم تم ہیں۔

موصل، پھر نصیبین

حضرت سلمان موصل پہنچے اور ان بزرگ کے حلقے میں شامل ہو گئے، وہ بھی نیک سیرت اور بے لوث بزرگ تھے۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اجل نے ان کو بھی آن لیا۔ حضرت سلمان نے گزارش کی: شام کے بزرگ کی نصیحت پر آپ کے پاس آیا تھا، آپ کس کے پاس حاضر ہونے کی تلقین کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا:

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

موصل سے شام کو جانے والی راہ پر واقع بستی نصیبین میں مقیم ایک نیک مسیحی پیشوا صحیح دین عیسوی پر عمل پیرا ہیں۔ چنانچہ حضرت سلمان ان کی نصیحت پر نصیبین چلے آئے، جہاں انھیں خوب اطمینان ملا۔ اللہ کے اس برگزیدہ بندے کو اللہ کا بلاوا آیا تو دم آخریں بھرائی ہوئی آواز میں بولے: بیٹا، دنیا میں اب دین کہاں رہ گیا ہے؟ روم کے شہر عموریہ میں ایک پابند شرع بزرگ پاکیزہ زندگی گزار رہے ہیں، ان کی خدمت میں حاضری دو۔ وہ واقعی بڑے ہی اللہ والے انسان تھے۔ حضرت سلمان شب ان کی دعاؤں اور عبادات میں شامل ہوتے اور دن میں ذکر الٰہی کی مجلسوں سے مستفید ہوتے۔

عموریہ میں

عموریہ کے قیام کے دوران میں حضرت سلمان محنت مزدوری بھی کرتے رہے۔ ان کے پاس کافی مال، گائیں اور بکریاں جمع ہو گئیں، مگر سکون اور خوش حالی کے دن جلد بیت جاتے ہیں۔ اللہ والے بزرگ کو اللہ کا پیام آیا تو انھوں نے عرض کیا: حضرت میں نے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھائی ہیں، اب آپ بھی رخصت ہو رہے ہیں، میں کہاں جاؤں؟ وہ درد بھری آواز میں بولے: اب دنیا میں ایک شخص بھی ایسا نہیں رہا جو حضرت عیسیٰ کا سچا پیروکار ہو۔ ہاں اللہ کے آخری رسول کی بعثت کا زمانہ بالکل قریب آ گیا ہے۔ آپ عرب کی سرزمین میں پیدا ہوں گے اور دین ابراہیم کی پیروی کریں گے۔ کچھ عرصہ اپنے شہر میں رہ کر دین کی تعلیم دیں گے، لیکن لوگوں کی اذیتوں سے تنگ آ کر ایسے شہر کی طرف ہجرت کریں گے جہاں دو سیاہ پتھریلی زمینوں کے درمیان کھجوروں کے باغات ہیں۔ ان کی تین کھلی نشانیاں ہوں گی جن کے ذریعے سے تم انھیں پہچان سکو گے۔ صدقہ کا مال نہیں کھائیں گے، ہدیہ خوشی خوشی قبول کر لیں گے اور آپ کے دونوں مونڈھوں کے درمیان مہر نبوت ہو گی۔ ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہونا۔

سوے مدینہ

حضرت سلمان نے بزرگ کی وصیت دل میں بٹھالی اور عرب کی طرف سفر کرنے کا وسیلہ ڈھونڈنے لگے۔ کچھ دنوں کے بعد عرب کے قبیلہ بنو کلب کا ایک تجارتی قافلہ عموریہ سے گزرا تو انھوں نے قافلے کی معیت حاصل کرنے کے لیے اپنی تمام بکریاں اور گائیں ان کے حوالے کر دیں۔ قافلہ منزل بہ منزل چلتا ہوا وادی قریٰ پہنچا تو قافلہ والوں نے دغا کی اور اس شخص کو جس نے اپنی ساری پونجی کے بدلے میں ان کا ساتھ چاہا

تھا، غلام بنا کر یوشع نامی ایک یہودی کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ بے کسی کے دن آ چکے تھے، حضرت سلمان دن بھر یہودی کے باغات کی دیکھ بھال کرتے اور رات کو رب کے حضور کھڑے ہو کر دعائیں کرتے کہ مجھے نبی آخر الزماں کی خدمت میں پہنچا دے۔ اللہ نے ان کی دعائیں سن لیں، ان کے یہودی آقا کا چچا زاد بھائی عثمان بن اشہل مدینۃ النبی میں آباد قبیلہ بنو قریظہ سے وادی قریٰ آیا اور حضرت سلمان فارسی کو خرید کر ساتھ لے گیا۔ حضرت سلمان کو مدینہ خوب پسند آیا، دو سیاہ پتھریلی زمینوں (یا پہاڑیوں) کے مابین کھجور کے باغات دیکھ کر انھیں عموریہ کے رہبر کی بتائی ہوئی نشانیاں یاد آ گئیں اور وہ خوشی سے جھوم اٹھے۔

بارگاہ نبوی میں پہلی حاضری

انھی دنوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت کی تھی۔ حضرت سلمان اپنے نئے آقا کے باغ میں کھجور کے درخت پر چڑھے کام کر رہے تھے جو اسی درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ اس کا عم زاد تیز تیز چلتا ہوا آیا اور بولا: بھائی، اللہ بنو قیلہ (قبائل اوس و خزرج، قیلہ: اوس و خزرج دونوں قبیلوں کی ماں) کو برباد کرے، آج قبا میں ایک ایسے شخص کے استقبال کے لیے جمع ہیں جو مکہ سے آیا ہے اور اپنے آپ کو اللہ کا رسول بتاتا ہے۔ یہ سنتے ہی حضرت سلمان کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی اور ان پر لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ جلدی جلدی پیڑ سے اترے اور یہ خوش خبری سنانے والے سے تفصیل پوچھنے لگے۔ ان کے مالک کو غصہ لگا اور اس نے پوری قوت سے گھونسا مار کر کہا: تم سے مطلب؟ چل اپنا کام کر۔

حضرت سلمان گھڑیاں گننے لگے کہ کب باغ کا کام ختم ہو گا اور کب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ شام ہوتے ہی وہ کھانے پینے کی کچھ چیزیں لے کر سوے قبا روانہ ہو گئے۔ آپ کی مجلس میں پہنچے اور ایک دستر خوان میں کھجوریں یہ کہہ کر پیش کیں کہ میں نے سنا ہے کہ آپ نیک انسان ہیں اور آپ کے اصحاب غریب اور حاجت مند ہیں، میں نے صدقہ کرنے کے لیے آپ سے زیادہ کسی کو حق دار نہیں سمجھا۔ آپ نے کھجوریں صحابہ کی طرف بڑھا دیں اور خود نہ چکھیں۔

علامات نبوت کی تصدیق

نبوت کی پہلی علامت مل چکی تھی۔ حضرت سلمان کچھ دیر آپ کی خدمت میں بیٹھ کر چلے آئے اور پھر کار غلامی میں مشغول ہو گئے۔ اس دوران میں انھوں نے کھانے پینے کی کچھ اور اشیا اکٹھی کیں اور بارگاہ رسالت

میں حاضر ہوئے، تب آپ مدینہ منتقل ہو چکے تھے۔ عرض کیا: میں نے دیکھا ہے کہ آپ صدقہ نہیں کھاتے، اس لیے یہ چیزیں آپ کے لیے ہدیہ لایا ہوں۔ آپ نے خوشی سے قبول فرمائیں، خود تناول کیں اور صحابہ کو بھی پیش فرمائیں۔ یہ نبوت کی دوسری نشانی تھی۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضرت سلمان فارسی نے دونوں بار لکڑیاں کاٹیں اور انھیں بیچ کر کھانا خریدا (احمد، رقم ۲۳۷۱۲)۔

تیسری نشانی کی تصدیق کے لیے انھیں کچھ انتظار کرنا پڑا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بقیع الغرقد میں اپنے صحابی حضرت کلثوم بن ہدم کے جنازے میں شریک تھے کہ حضرت سلمان وہاں پہنچے۔ سلام کرنے کے بعد بیٹھے نہیں، بلکہ آپ کے پیچھے گھومتے رہے تاکہ آپ کی کمر پر مہر نبوت دیکھ سکیں۔ آپ نے تہ بند کے طور پر اور اوڑھنے کے لیے دو چادریں لے رکھی تھیں، حضرت سلمان کی بے قراری دیکھ کر ان کا منشا جان لیا، کندھے والی چادر نیچے سرکا دی اور فرمایا: دیکھ لو جس کا تمھیں کہا گیا ہے۔ مہر نبوت پر نظر پڑتے ہی حضرت سلمان فارسی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور وہ بے اختیار جھک کر اسے چومنے لگے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں محبت و شفقت سے اپنے سامنے بٹھا لیا، تب انھوں نے راہ حق کے اپنے سفر کی پوری داستان سنائی۔ حضرت سلمان اسی وقت ایمان لا کر غلامی مصطفیٰ میں آ گئے۔

غلامی سے آزادی

اب انھیں ایک ہی فکر تھی کہ کسی طرح یہودی کی مِلک سے آزاد ہو جائیں۔ آپ نے مشورہ دیا کہ اس سے عہد مکاتبت کر لو، یعنی کچھ مال (بدل کتابت) ادا کر کے آزادی کا پروانہ لے لو۔ چنانچہ یہ طے ہوا کہ حضرت سلمان چالیس اوقیہ سونا (چاندی والی روایت درست نہیں) دیں گے اور تازہ گڑھے کھود کر کھجور کے تین سو (شاذ روایت: پانچ سو) پودے لگائیں گے۔ جب یہ پھل دینے لگیں گے تو وہ آزاد ہو جائیں گے۔ (ایک اوقیہ سونا: پونے تیس یا سوا اٹھائیس گرام یا سوا تین تولہ۔ ایک اوقیہ چاندی: ایک سو انیس گرام۔ دیگر اجناس کا اوقیہ: ایک سو ستائیس گرام)۔ حضرت سلمان کے آقا عثمان بن اشہل قرظی سے کیا جانے والا معاہدۂ مکاتبت حضرت علی نے تحریر کیا، حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت ابوذر، حضرت مقداد اور حضرت ابوالدرداء گواہوں میں شامل تھے۔

اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حکم دیا: اپنے بھائی کی مدد کرو۔ چنانچہ ہر صحابی نے اپنی گنجایش کے مطابق دس، پندرہ، بیس اور تیس پودے دیے۔ آپ نے حضرت سلمان سے فرمایا: تم گڑھے کھود کر

ہمیں خبر کرو، دیگر صحابہ نے کھدائی میں ان کا ساتھ دیا۔ پھر آپ خود تشریف لے گئے، آپ کے اصحاب پودے پکڑاتے جاتے اور آپ اپنے دست مبارک سے لگاتے اور گڑھا برابر کرتے جاتے۔ اسی سال ان پودوں پر پھل آگیا، ان میں سے ایک پودا بھی خراب نہ ہوا۔

ابھی سونا واجب الادا تھا۔ انھی دنوں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بنو سلیم کی کان سے مرغی کے انڈے جتنی سونے کی ڈلی آئی۔ آپ پکارے: مکاتبت کرنے والا فارسی کہاں ہے؟ حضرت سلمان حاضر ہوئے تو فرمایا: یہ لو اور اس سے اپنا بدل کتابت ادا کر دو۔ وہ بولے: یا رسول اللہ، اس سے میرے ذمہ میں آنے والا سونا کہاں ادا ہو گا؟ فرمایا: پکڑ تو لو، اللہ اسی سے تمھاری خلاصی کر دے گا۔ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق آپ نے ڈلی زبان پر الٹ پلٹ کر واپس کی (احمد، رقم ۲۳۷۳۸)۔ حضرت سلمان نے سونے کا وزن کرایا تو پورے چالیس اوقیہ نکلا اس طرح وہ سونا ادا کر کے آزاد ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رہائی پانے میں حضرت سلمان کی مدد کی تھی، اس لیے ان کا شمار آپ کے موالی میں ہوتا ہے (احمد، رقم ۲۳۷۳۷۔ السیرۃ النبویۃ، ابن ہشام، جلد اول، حدیث اسلام سلمان، المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۶۰۶۵۔ مسند بزار، رقم ۲۵۰۰)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قصۂ سلمان اور تعدد روایات

حضرت سلمان فارسی نے اپنے یہ حالات زندگی حضرت عبد اللہ بن عباس کو خود بتائے اور انھوں نے آگے روایت کیے۔ ہم نے اسی کو نقل کرنا مناسب سمجھا ہے۔ دوسری روایات زید بن صوحان، سلامہ عجلی، ابو عثمان نہدی اور ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن نے نقل کی ہیں جن میں ان کے قبول اسلام کا قصہ بہت مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے: مثلاً حضرت سلمان فارسی کا یتیم ہونا، ان کا ایک چٹان کی غار میں مقیم مسیحی راہبوں کی معیت اختیار کرنا، پھر بیت المقدس جانا، بنو جہینہ کی ایک عورت یا ایک انصاریہ حضرت خلیسہ کی غلامی میں آنا اور حضرت ابو بکر کا انھیں خرید کر آزاد کرنا (مستدرک حاکم، رقم ۶۵۴۳۔ سیر اعلام النبلاء: جلد اول، قصۃ سلمان الفارسی)۔ حاکم نے زید بن صوحان کی روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ ابن کثیر کہتے ہیں: اس میں بہت کم زوریاں ہیں، جب کہ حضرت عبد اللہ بن عباس کی روایت سند کے اعتبار سے قوی اور امام بخاری کی روایت کے قریب تر ہے۔ ذہبی نے ابو سلمہ کی روایت نقل کرنے کے بعد اسے شبہ موضوع قرار دیا۔

ابن حجر کہتے ہیں: حضرت سلمان فارسی کے قبول اسلام کے قصے میں ایسا اختلاف ہے کہ تمام مرویات کو یکجا نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے مسند احمد (رقم ۲۳۷۳۷) اور مستدرک حاکم (رقم ۶۵۴۳) کی روایات کو صحیح ترین

قرار دیا ہے، حالاں کہ یہ دونوں آپس میں مطابقت نہیں رکھتیں۔

حضرت سلمان فارسی خود کہتے ہیں کہ وہ باری باری دس سے زیادہ لوگوں کی غلامی میں رہے (بخاری، رقم ۳۹۴۶۔ مصنف عبدالرزاق، رقم ۱۵۷۶۷)۔

نصاریٰ کے بارے میں اشکال

حضرت سلمان فارسی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یارسول اللہ، نصاریٰ کے بارے میں ارشاد کیجیے۔ آپ نے فرمایا: ان میں کوئی خیر ہے، نہ ان کے چاہنے والوں میں کوئی بھلائی ہے۔ حضرت سلمان یہ سوچ کر بوجھل دل سے اٹھ آئے کہ میں تو ان کو چاہتا ہوں، وہ نماز پڑھتے تھے، روزہ رکھتے تھے اور بعث بعد الموت پر یقین رکھتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کو پا لیتے تو آپ کی تصدیق کرتے اور آپ کی پیروی کرتے۔ تبھی اللہ کے یہ ارشادات نازل ہوئے: 'لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ'، "تم اہل ایمان سے عداوت میں سب سے زیادہ شدت رکھنے والا یہود اور شرک کرنے والوں کو پاؤ گے اور اہل ایمان کی دوستی میں سب سے قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں، ان کی دوستی اس وجہ سے ہے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا درویش پائے جاتے ہیں اور یہ تکبر نہیں کرتے" (المائدہ ۵: ۸۲)۔ 'اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ'، "بے شک جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور جو نصرانی اور صابی ہیں، جو بھی اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا تو ان سب کو ان کے رب کے ہاں اجر ملے گا اور ان کو ڈر ہو گا نہ وہ غم زدہ ہوں گے" (البقرہ ۲: ۶۲)۔ تب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسی کو بلا کر فرمایا: آپ کے اصحاب ان لوگوں میں سے تھے جن کا اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ذکر کیا ہے۔

ابن کثیر کہتے ہیں: یہودیوں میں سے جو تورات اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سنت پر قائم رہا، مومن ہے، تاآنکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آ گئے۔ اب اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی نہ کی تو ہلاک ہو گا۔ اسی طرح نصاریٰ میں سے جو انجیل اور شریعت عیسوی سے جڑا رہا، صاحب ایمان ہے، یہاں تک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہو گئی۔ اب اس نے گذشتہ شریعت کو ترک کر کے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع نہ کیا

توآخرت میں برباد ہوگا (تفسیر القرآن العظیم، سورۂ بقرہ: آیت ۶۲)۔

مواخات

مدینہ آمد کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین وانصار میں مواخات قائم فرمائی۔ حضرت انس بن مالک کے گھر میں طرفین کے پینتالیس پینتالیس افراد بھائی چارے کے اس عہد میں شریک ہوئے۔ اس موقع پر آپ نے حضرت سلمان فارسی کو حضرت حذیفہ بن یمان کا بھائی قرار فرمایا۔ دوسری روایت ہے کہ ان کی مواخات حضرت ابوالدرداء عویمر بن ثعلبہ سے قرار پائی (بخاری: مناقب الانصار)۔ بعد میں جنگ بدر کے موقع پر جب فرمان الٰہی 'وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ'، ''اور اللہ کی کتاب میں رحم کا رشتہ رکھنے والے اہل ایمان اور مہاجرین سے زیادہ ایک دوسرے کے حق دار ہیں'' (الاحزاب ۳۳: ۶) نازل ہوا تو اہل مواخات کو ملنے والا حق وراثت ختم ہوگیا۔ اسی لیے زہری نہیں مانتے کہ حضرت سلمان کی یا جنگ بدر کے بعد کسی صحابی کی مواخات ہوئی ہو، کیونکہ تب احکام میراث منسوخ ہو چکے تھے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جنگ بدر و جنگ احد

حضرت سلمان فارسی ہجرت کے پہلے سال مشرف بہ اسلام ہوئے تھے، لیکن بدر و احد کے غزوات میں حصہ نہ لے سکے، کیونکہ تب وہ یہودی کی غلامی سے آزاد نہ ہوئے تھے۔

جنگ خندق

شوال ۵ھ (مارچ ۶۲۷ء): آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ تشریف آوری کے بعد اوس و خزرج اور مدینہ کے یہودی قبائل کے ساتھ باہمی صلح و امن کا معاہدہ کیا، جسے 'میثاق مدینہ' یا 'صحیفۃ المدینۃ' کہا جاتا ہے۔ ۴ھ میں یہودی قبیلہ بنونضیر نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان لینے کی کوشش کی۔ چنانچہ انھیں مدینہ سے جلاوطن کر دیا گیا۔ وہ پھر بھی اسلام کے خلاف سازشیں کرتے رہے، ان کے لیڈر عبداللہ بن سلام، حیی بن اخطب اور کنانہ بن ربیع مکہ گئے اور قریش کے لیڈر ابوسفیان کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کرنے کا معاہدہ کیا۔ انھوں نے بنوغطفان، بنوسلیم، بنومرہ اور بنواشجع کے قبائل کو اپنے ساتھ ملا کر دس ہزار کی نفری اکٹھی کر لی، جب کہ مسلمانوں کی تعداد تین ہزار تھی۔

آپ کو ان کی کارروائیوں کا پتا چلا تو صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت سلمان فارسی نے بتایا کہ ایران میں ہم جب دشمن میں گھر جاتے تھے تو اپنے گرد خندق کھود لیتے تھے۔ منوچہر بن ایرج پہلا بادشاہ تھا جس نے اسے جنگی تدبیر کے طور پر استعمال کیا۔ یہ تجویز آپ کو پسند آئی اور اسی پر عمل کا فیصلہ فرمایا۔

خندق کی کھدائی

آپ گھوڑے پر سوار ہوئے اور صحابہ کے ساتھ مدینہ کے گرد چکر لگایا۔ شمال کی جانب اجم الشیخین (لفظی مطلب: دو سرداروں کے قلعے، یہ بنو عبدالاشہل کا علاقہ تھا) یا یہودیوں کے قلعہ راتج سے آپ نے خط کھینچنا شروع کیا اور بنو حارثہ کے علاقے اور جبل ذباب سے ہوتے ہوئے اسے وادی مذاذ تک لے آئے، کوہ سلع آپ کے عقب میں تھا۔ پھر آپ نے چالیس چالیس ذراع (ایک ذراع: قریباً اٹھارہ انچ) کے حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصہ کھودنے کے لیے دس دس صحابہ کی جماعت مقرر فرمائی۔ اس موقع پر مہاجرین و انصار میں نزاع پیدا ہو گیا، مہاجرین کا کہنا تھا کہ سلمان مہاجر ہیں، جب کہ انصار کا اصرار تھا کہ سلمان بھی انصاری ہیں۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سلمان کا تعلق ہم سے ہے، سلمان اہل بیت میں سے ہیں (مستدرک حاکم، رقم ۶۵۳۹۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۶۰۴۰)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

چٹان کا ٹوٹنا اور فتح کی پیش گوئی

حضرت سلمان فارسی، حضرت عمرو بن عوف، حضرت حذیفہ بن یمان، حضرت نعمان بن مقرن اور چھ انصاری صحابہ اپنے حصے میں آنے والی کھدائی کر رہے تھے۔ کھدائی کرتے کرتے ایک سفید چکنی چٹان نمودار ہوئی جو اس قدر سخت تھی کہ صحابہ کے پھاوڑے ٹوٹ گئے، مگر چٹان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ صحابہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کھینچے ہوئے خط سے ہٹنا نہ چاہتے تھے، اس لیے حضرت سلمان فارسی آپ کے پاس پہنچے۔ آپ اپنی چادر خندق کے کنارے پر رکھ کر ان کے ساتھ نیچے اترے، کدال لی، یہ آیت تلاوت فرمائی: 'وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ'، ''تمھارے پروردگار کا حکم سچائی اور انصاف کے ساتھ پورا ہوا، کوئی نہیں جو اس کے کلمات کو بدل سکے، وہ سننے والا اور علم رکھنے والا ہے'' (الانعام ۶: ۱۱۵) اور چٹان پر زوردار ضرب لگائی جس سے اتنی تیز روشنی نکلی کہ سنگلاخ زمینوں کے مابین واقع مدینہ چمک اٹھا اور ایک تہائی چٹان ٹوٹ گئی۔ حضرت سلمان فارسی پاس کھڑے دیکھ رہے تھے، مسلمانوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔

آپ نے دوسری اور تیسری ضربیں لگائیں، ہر دو دفعہ ایک تہائی چٹان ٹوٹی اور خندق کے اطراف روشن ہو گئے، مدینہ اہل ایمان کے نعرہ ہاے اللہ اکبر سے گونجتا رہا۔ حضرت سلمان فارسی نے کہا: یارسول اللہ، میں نے وہ کچھ دیکھا جو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ آپ نے پوچھا: تمھیں کیا نظر آیا؟ حضرت سلمان بولے: میں نے بجلی دیکھی جو موج کے مانند پھیل رہی تھی۔ آپ نے دوسرے صحابہ سے دریافت فرمایا: کیا آپ لوگوں نے بھی یہی دیکھا؟ ان کے ہاں کہنے پر وضاحت فرمائی: تم نے سچ کہا، میں نے پہلی چوٹ لگائی تو اس کی روشنی میں حیرہ کے محلات اور کسریٰ کا مدائن دیکھا۔ ایک صحابی نے عرض کیا: یارسول اللہ، دعا کیجیے کہ اللہ ان علاقوں کو ہمارے زیر نگیں کر دے۔ آپ نے فرمایا: جبریل نے مجھے بتایا ہے کہ میری امت ان پر قابض ہو گی۔ دوسری ضرب لگانے پر مجھے روم کے سرخ محلات دکھائی دیے۔ صحابہ نے پھر عرض کیا: یارسول اللہ، دعا کیجیے کہ اللہ ان علاقوں پر ہمیں فتح دے۔ آپ نے فرمایا:، جبریل نے خبر دی ہے کہ میری امت ان پر غالب ہو گی۔ کدال تیسری مرتبہ چلانے پر صنعا کے ایوان نظر آئے، جبریل نے ان پر بھی میری امت کے غلبے کی خوش خبری دی (نسائی، رقم ۳۱۷۸۔ طبقات ابن سعد ۳/۵۸)۔ نسائی کی روایت میں صنعا کی جگہ حبشہ اور اس کے ارد گرد کے علاقوں کا ذکر ہے اور آپ کا فرمان مذکور ہے کہ حبشہ کو رہنے دو اور ترکوں سے تعرض نہ کرو، جب تک وہ تم سے لا تعلق رہتے ہیں۔ ''سیرت ابن ہشام'' کی تفصیل اس طرح ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خندق کے قریب تھے اور حضرت سلمان فارسی کی مشقت کو دیکھ کر خود نیچے اترے، آپ کی ضربوں سے نکلنے والی روشنی حضرت سلمان نے دیکھی اور آپ سے اس کی بابت استفسار کیا، آپ نے جن مفتوحات کی بشارت دی، علی الترتیب یمن، شام و مشرق اور مغرب تھے۔ بیہقی کہتے ہیں: حضرت سلمان فارسی نے روشنی کی سمتوں کا بھی مشاہدہ کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مفتوحات کا ذکر فرما کر ان کی تائید کی۔

اہل ایمان کا اظہار مسرت اور منافقین کا بغض

اس موقع پر اہل ایمان نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: یہ سچے اور پاک نبی کا وعدہ ہے، انھوں نے محاصرے کے بعد نصرت و فتح کا وعدہ کیا ہے، جب کہ منافقین نے ہرزہ سرائی کی: تمھیں خیال نہیں آتا کہ نبی تم سے جھوٹے وعدے کر رہے ہیں؟ تب فرمان الٰہی نازل ہوا: 'وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا'، ''اہل ایمان

نے مشرکوں کے جتھے دیکھے تو کہا: یہ ہے جس کا ہم سے اللہ و رسول نے وعدہ کیا اور اللہ و رسول کا فرمانا سچا تھا اور اس آزمایش نے ان کے ایمان و اذعان میں اضافہ ہی کیا'' (الاحزاب ۳۳: ۲۲)۔ 'وَاِذۡ يَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗۤ اِلَّا غُرُوۡرًا'، ''جب منافق اور وہ جن کے دلوں میں روگ ہے، کہنے لگے: اللہ و رسول کے ہم سے کیے گئے وعدے فریب ہی نکلے (الاحزاب ۳۳: ۱۲)۔

حصار طائف

۱۴ھ (۶۳۰ء): غزوۂ حنین میں انجام کار بنو ہوازن، بنو ثقیف اور ان کے اتحادیوں کو شکست ہوئی۔ شکست خوردہ فوج کا ایک حصہ اوطاس پہنچا، اسے حضرت ابو عامر اشعری نے زیر کیا اور خود بھی شہادت پائی۔ دوسرا حصہ نخلستان چلا گیا۔ بنو ثقیف اور حلفا پر مشتمل تیسرا حصہ طائف پہنچا جہاں اس قیسی قبیلے نے اپنے قلعے میں سال بھر کی ضروریات زندگی جمع کر رکھی تھیں۔ اہل طائف جب قلعہ بند ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا محاصرہ کر لیا جو اٹھارہ یا بیس سے زائد دن جاری رہا اور کسی نتیجے کے بغیر ختم ہو گیا۔ محاصرے کی ابتدا میں کفار کی شدید تیر اندازی سے بارہ مسلمان شہید اور بہت سے زخمی ہو گئے تو آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت سلمان فارسی نے کہا: یا رسول اللہ، میرا خیال ہے کہ ہم ان کے قلعے پر منجنیقیں نصب کر دیں، سر زمین فارس میں ہم قلعوں پر منجنیقیں لگا کر فتح پا لیتے تھے۔ ایسا نہ کیا تو محاصرہ لمبا ہو جائے گا۔ چنانچہ حضرت یزید بن زمعہ (یا حضرت خالد بن سعید) منجنیق لائے اور آپ نے اپنے دست مبارک سے نصب کی۔ اس غزوہ میں دبابہ کا استعمال بھی کیا گیا، یہ لفظ آج کل جنگی ٹینک کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس وقت لکڑی اور چمڑے سے بنے ہوئے کیبن کو دبابہ کہا جاتا تھا جس میں سپاہیوں کو بٹھا کر نقب لگانے کے لیے قلعے کی فصیل کے پاس بٹھا دیا جاتا تھا۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com

محمد ذکوان ندوی

وقت اور صحت

ہمارے درمیان علم واخلاق اور تعلیم وتربیت کا جو بحران پیدا ہوا ہے، اُس کا نتیجہ یہ ہے کہ وقت کی ناقدری اور غیر منصوبہ بند طرز حیات عرصے سے گویا اب ہمارا ایک قومی شعار بن چکا ہے۔ عام زندگی میں اِسی کا ایک ظاہرہ ہمارے اکثر لوگوں کا دیر سے سونا اور دیر سے اٹھنا ہے[1]۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

۱۔ خدا نے دن کو اصلاً کام کے لیے اور رات کو آرام کے لیے بنایا ہے (الفرقان ۲۵: ۴۷۔ النبا ۷۸: ۱۰-۱۱)۔ یہ صرف ایک سادہ مثال ہے، ورنہ موجودہ زمانے میں فطرت کے خلاف اِس قسم کے بہت سے 'فسادات' وانحرافات عام ہو گئے ہیں۔ جیسے ''ڈیویلپمنٹ'' کے نام پر کھیت، درخت اور جنگلات کا خاتمہ کر کے ناقابل تلافی حد تک زمین کا توازن بگاڑ دینا؛ پانی، ہوا اور روشنی جیسی بنیادی اور فطری چیزوں کے حصول کو تمام تر کمرشلائز کر دینا، پانی جیسی عام نعمت کو خرید کر پینا، جو بلاشبہ تاریخ کی وہ بدترین غلامی ہے جس میں آج کا انسان ''تہذیب و تجدید'' کے پر فریب نام پر مبتلا ہے۔ اِسی طرح 'مصنوعی ذہانت' (AI) جیسا سنگین انسانی اور اخلاقی بحران، وغیرہ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں اسرائیلی مصنف یوول نوواہراری کی کتاب: ''21 Lessons for the 21st Century''۔

فطرت کے خلاف مذکورہ قسم کی بے اعتدالی اور انحراف کوئی سادہ بات نہیں۔ قرآن کے مطابق، وہ نظام فطرت میں 'تغییر' (النساء ۴: ۱۱۹) اور زمین میں 'فساد' (الاعراف ۷: ۵۶، ۸۵) کے ہم معنی ہے۔ موجودہ حالات انسان کے اِنھی 'اعمال' (مفسدانہ سرگرمیوں) کا نتیجہ ہیں۔ چنانچہ اب جدید تہذیب اپنے اِس فساد کے مہلک انجام کو بھگت رہی ہے۔ اِس ہول ناک صورت حال سے نکلنے کا واحد راستہ صرف یہ ہے کہ آج کا انسان 'فسادِ بر و بحر' کی اِس حالت سے لوٹ کر دوبارہ 'صلاحِ بر و بحر' کی ربانی حالت کو مکمل طور پر اختیار کر لے۔ اِس کے سوا، خدا اور کائنات کی نسبت سے، اپنے جرم کو

ایک زندہ فرد اور قوم کی پہچان یہ ہے کہ وقت اُس کے نزدیک ''کاٹنے'' جیسی کوئی چیز نہیں ہوتا، بلکہ یہ 'زندگی' کا وہ قیمتی لمحہ ہوتا ہے جسے بھرپور طور پر وصول کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ مشہور عربی مثل ہے: 'الوقتُ سیفٌ، إن لَمْ تَقْطَعْهُ قَطَعَکَ'، یعنی وقت ایک تلوار ہے، اگر تم اُس کو نہ کاٹو تو وہ یقیناً تمھیں کاٹ دے گا۔ وقت کا کم تر استعمال ہمیشہ اُس کے برتر استعمال کی قیمت پر ہوتا ہے، جو بے شعوری کا نتیجہ ہے، اور اِس کا انجام محرومی کے سوا اور کچھ نہیں۔ ایک مغربی مفکر نے وقت کی اِسی اہمیت کے متعلق بجا طور پر کہا تھا کہ — فارغ اوقات کا بہتر استعمال تہذیب کی آخری بلندی کی علامت ہے، اور ابھی بہت کم لوگ تہذیب کی اِس بلندی تک پہنچ سکے ہیں!

وقت کے استعمال کا بہترین طریقہ اپنے نشانے اور اپنے طے شدہ پروگرام کے اعتبار سے، اپنی زندگی کی منصوبہ بندی ہے۔ اِس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنی ترجیحات متعین کر کے اپنے وقت اور اپنی توانائی کو اُسی محاذ پر صرف کرے۔

یہی صحت (health) کا معاملہ ہے۔ کسی آدمی کے پاس سب سے بڑی جو چیز ہوتی ہے، وہ وقت اور صحت ہے[2]، مگر آدمی کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی بے شعوری کی بنا پر اِس معاملے میں سب سے زیادہ گھاٹے میں رہتا ہے۔ وہ وقت اور صحت، دونوں کو برباد کر دیتا ہے۔

صحت کے لیے ضروری ہے کہ آدمی ہر اعتبار سے، سادگی اور اعتدال کو اختیار کرے۔ اِس کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی تعیش اور خواہش پرستی کے بجائے ضرورت[3] پر قانع[4] رہے؛ وہ اعلیٰ معیارِ زندگی (high standard of

---

چھپانے کے لیے ''گلوبل وارمنگ'' کے نام پر کی جانے والی مختلف قسم کی سرگرمیاں ''پیوند کاری'' (patch up) سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ اِس طرح کے امور میں جوہری تبدیلی (sea change) مطلوب ہوتی ہے، نہ کہ مذکورہ قسم کی پیوند کاری۔ انسان کے ''ہاتھوں'' برپا ہونے والے اِس 'فساد' کا انجام بظاہر اِس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اب انسان اِسی دنیا میں اپنے اِس 'عمل' کا کچھ مزہ چکھے (الروم ۳۰: ۴۱)۔

۲۔ 'نعمتانِ مغبونٌ فیهما کثیرٌ من الناس: الصِّحةُ والفَراغ' (بخاری، رقم ۶۴۱۲)، یعنی وقت اور صحت اللہ کی دو ایسی عظیم نعمتیں ہیں جن کے متعلق اکثر لوگ غفلت اور ناقدری کا شکار رہتے ہیں۔

۳۔ ''ضرورت'' کے لیے کوئی قانونی حد بندی ممکن نہیں۔ ایک سلیم الفطرت انسان خود اپنی عقل اور حالات کے تحت اِس کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

living)[۵] اور نمایشی طرزِ حیات (ostentatious living) کے پرفریب ’نصب العین‘ سے اپنے آپ کو دور رکھے؛ وہ ورزش، چہل قدمی، کھیل کود اور پیدل چلنے کو اپنی زندگی کا مستقل معمول بنائے؛ وہ سادہ اور صحت بخش کھانے کو ترجیح دے اور شکم سیری کی مہلک عادت کے بجائے کم خوری کی صحت بخش عادت کا طریقہ اختیار کرے —— قرنطینہ کے دوران روزوں کا یہ مہینا، ذِکر و عبادت اور تلاوت و تدبر کے ساتھ، وقت اور صحت کی حفاظت اور بامقصد زندگی کی تربیت کا ایک بہترین لمحہ ہے۔ وہ ہمارے لیے سادگی اور فطرت کی طرف واپسی کی ایک جبری درس گاہ بھی ہے اور اُس کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے کا ایک نادر موقع بھی۔

(لکھنؤ ۲۰/ اپریل ۲۰۲۰ء)

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۴۔ ’قد أفلح مَن أسلَمَ، ورُزِق كَفافًا، وقنَّعَهُ اللّٰهُ بما آتاه‘ (مسلم، رقم ۱۰۵۴)۔ یعنی بلاشبہ کامیاب وہی شخص ہے جس نے اللہ کی فرماں برداری کی، اُس کو ضرورت بھر رزق ملا اور مزید کی فکر کرنے کے بجائے اُس نے اللہ کی طرف سے ملنے والی نعمتوں پر دل سے قناعت اختیار کی۔

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

۵۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں:

-A Dictionart of Economics and Commerce: J. L. Hanson, Published by Mackdonald & Evans Ltd., London- 1969.

-The Affluent Society, by J. K. Galbraith, A Mariner Book, New York- 1998.

Trusted Name for Last 65 years

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

Best Treatment for Your Branded Kurtas, Bosky
Ladies' Shalwar Suits, Trousers, Dress Shirts & Jackets

Since 1949
Snowhite
DRYCLEANERS
Largest Cleaning Network ... COUNTRYWIDE!

TQCSI
Quality Certified
ISO 9001 : 2000

Brands of the year Award
IT'S ALL ABOUT CHAMPIONS
2011-2012

Web: www.snowhite.com.pk
Tel: 021-38682810